List of Lesson B. Com 1st Year Stream "B" Poetry

Poetry

1.	Dabistan-e Delhi	Dr. Khudaija Tahira
2.	Dabistan-e Lucknow	Dr. Khudaija Tahira
3.	Urdu Shayeri Ka Irtiqa	Dr. Khudaija Tahira
4.	Urdu Ghazal Ek Jaiza	Dr. Khudaija Tahira
5.	Meer Taqui Meer	Dr. Khudaija Tahira
6.	Meer Dard	Dr. Khudaija Tahira
7.	Mirza Ghalib	Dr. Khudaija Tahira
8.	Momin Khan Momin	Dr. Khudaija Tahira
9.	Jadeed Nazam	Dr. Khudaija Tahira
10.	Nazeer Akbar Abadi	Dr. Khudaija Tahira
11.	Altaf Hussain Haali	Dr. Khudaija Tahira
12.	Intekhab -a- Mosadds	Dr. Khudaija Tahira
13.	Allama Iqbal	Dr. Khudaija Tahira
14.	Shuaa-e-ummeed and Bazm-e-Anjum	Dr. Khudaija Tahira

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

دبستان دھلی

ہر تہذیب و تمدن اپنا ایک فلسفہ زندگی رکھتا ہے جس پر اس کی قدریں ٹکی ہوتی ہیں شاعری کا تعلق چونکہ انسانی زندگی سے ہوتا ہے اس لیے وہ تفکرات شاعری میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ کسی مقام کے تمدن کی بنیادیں اس کے اقتصادی حالات اور وہاں کے باشندوں کے عقائد ہوا کرتے ہیں۔ جہاں تک دلی کی اقتصادی اور معاشی حالات کا ذکر ہے بہت افراتفری کا ماحول تھا اردو جب سے پروان چڑھی تب سے وہ آفات اور ہنگاموں سے دو چار ہوتی رہی شاعروں نے شہر آشوب لکھے بہادر شاہ ظفر کی زبان سے نکلے ہو یہ شعر

میرا رنگ روپ بگڑ گیا ، میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں میں اجڑ گیا ، میں اسی کی فصل بہار ہوں

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہ سے لے کر ایک عام انسان بد حال و پریشان ہو، کسی طرح کا سکون نہ ہو زمانے کے انقلاب اور نشیب و فراز نے دلوں میں خوف بھر دیا ہو، نا کامی سے واسطہ پڑ رہا ہو تو وہ زندگی کے لوازمات کو کیا سمجھے گا۔

اس کے برعکس لکھنؤ میں دولت عیش پرستی تھی خزانے میں دولت کا انبار تھا۔ آصف الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ کے زمانے لکھنؤ کی سرمستیاں شباب پر تھیں ہر گوشہ دامن نشاط تھا اس لیے یہاں کے لوگوں میں سرخوشی سرمستی رنگین مزاج کارفرما تھی۔ ان حالات کا اثر وہاں کی شاعری میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

دہلی دبستان شاعری اپنے افتاد اور ذہنی مزاج شعری اور نقطہ نظر کے اعتبار سے نمایاں مقام کی حامل ہے۔ تہذیب وتمدن کے اثرات شعرو ادب پر گہرے نقش چھوڑتے ہیں۔ لکھنؤ تہذیب وتمدن دہلی سے بالکل مختلف تھا کسی بھی تہذیب تمدن کی تشکیل میں وہاں کے عوام کے اقتصادی حالات اور عقائد ونظریات ہوا کرتے ہیں دہلی میں سیاسی انتشار نے جوصورت حال پیدا کر دی تھی۔ اس میں عدم تحفظ کا احساس شدت سے پیدا ہو چلا تھا۔ دہلی میں قتل و غارت گری لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ جان و مال عزت و آبرو خطرے میں تھی۔ مسلسل بیرونی حملوں نے دہلی والوں کے دلوں میں ایک طرح کی شکستگی ومحرومی کا احساس شدت سے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں دہلوی شاعری کے یہاں فرار کی ذہنیت پیدا ہو چکی تھی۔ لوگ تصوف کی طرف مائل ہونا شروع ہوگئے تھے۔

تصوف اور صوفیانہ خیالت کے نتیجہ میں عشق حقیقی کا رجحان دہلی شاعری میں عام نظر آتا ہے۔ زندگی کو پانی کا بلبلہ سمجھتا اسی تصوف کے رجحان کا نتیجہ ہے۔ دنیا سے بے تعلق اور بے زاری قناعت پسندی اور صبر شکر اس کے اہم اجزاء ہیں۔ عشق حقیقی تک پہنچنے کے لیے مادّی عشق کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دہلوی شاعری کے یہاں یہ محبت یا عشق پرستی کی شکل میں ملتا ہے چونکہ اس طرح کی محبت وصل کا امکان نہیں رہتا اس لیے جدائی کا درد، بے قراری اور ہجراں نصیبی عام ہوتی ہے۔ عشق حقیقی کی کیفیات دہلوی شاعری میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہاں محبوب حقیقی ہے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔

قاصد نہیں یہ کام تیرا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لاسکے

حجاب رخ یار تھے اب یہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پروانہ تھا

جلو ہ کس جاپہ نہیں اس بت ہرجائی کا
یہ پریشانیاں نظر جرم ہے بینائی

ان کے محفل میں ذرا اپنا پتا بھی دینا
پاؤں پہ پاؤں جو رکھنا تو دعا بھی دینا

طلب حقیقی کی لذت جانتے ہوئے عشق مجازی کا ہونا دہلوی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ عشق مجازی ہے تو بہت گہرے روحانی تعلقات کے ساتھ اس کا سرچشمہ وہی حسن حقیقی سمجھا جاتا ہے۔ میرؔ اسی رنگ کے بادشاہ ہیں۔

جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کبھی تک کے دھ کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
تیرے کوچے میں ہم آئے تو ٹھہرٹھہر کے چلے گئے

گہرے قلبی واردات کے بیان کے سلسلہ میں دہلوی شاعروں کی ہجر نصیبی زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ جو جذبات میں گہرائی اور دل میں تڑپ پیدا کرتی ہے۔ یہ ہجر نصیبی براہ راست اسی تصوف کی نشاندہی کرتی ہے۔

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جل گیا ہم سے بجھایا نہ گیا

ہزاروں خواہش ایسی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

شاید اسی کا نام محبت سے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

لوگ کہتے ہیں کہ محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

شاعری کا تعلق چونکہ انسانی زندگی سے ہوتا ہے اس لیے تفکرات بھی شاعری میں شامل ہوتی ہے۔ دہلی کی شاعری چونکہ فکروفاقہ کشی کے دوران پروان چڑھی تھی۔ تصوف وہاں کی زندگی کا خاص رنگ تھا۔ وہاں کے سیاسی اور معاشی حالات نے اسے اور بھی فروغ دیا۔ دنیاوی دولت شان وشوکت کا ناقابل اعتبار سمجھا زندگی کے بے ثباتی پر یقین رکھا۔ انقلاب کو آسمان اور زمین کی گردش قرار دیا۔ یہ باتیں اس وقت عام تھیں اس لیے اس وقت کی شاعری میں بھی اس کا رنگ جھلکتا ہے۔

یہاں کے شعرا جن کا ملک تصوف تھا انہوں نے تمدن کے اثر سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

پہنچا جو آپ کو تو پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ میں کتنی دور تھا

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے نہ آئے تھے نہ اپنی خوشی چلے

امیر خسرو اور سعدی کا کوروی نے اردو الفاظ کا استعمال بھی اپنے کلام میں غزلیں نظمیں بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ پیش کیں، ولی دکنی سے سب سے پہلے دہلی کی شاعری شروع کی پہلے دور شعراء، آرزو، آبرو، مضمون شاکر

ناجی، یک رنگ، شاہ حاتم، مظہر جان جاناں اور فغاں کا نام آتا ہے۔شمالی ہندوستان میں پہلے صاحب دیوان شاعر فائز دہلوی کا نام آتا ہے۔یہ دور شاعری کا بہترین دور تھا سچائی اور سادگی کا خاص خیال رکھا گیا۔غزل ایہام گوئی اوررعایت لفظی سے پاک کی گئی ہے۔غزل کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں کو بھی کافی ترقی ملی۔

دوسرے دور کے اہم شعراء میں سودا، میر، درد، حاتم، میر حسن، قائم، یقین، سوز، اور اثر، وغیرہ مشہور ہیں۔ سودا کے قصیدے سے اور میر حسن کی مثنوی سحرالبیان بھی اسی دور کی دین ہے۔مثنوی کی کہانی اور اس کے پیش کرنے کا اندازہ اس کی سادگی اور انداز بیان نے اسے نمایاں مقام دلانے میں بڑی مدد کی۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر درد ہیں جن کے کلام میں صوفیانہ پاکیزگی پائی جاتی ہے اس لیے انہیں تصوف کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

تیسرے دور کے اہم شاعروں میں انشاء، مصحفی، جرأت، اثر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ ان لوگوں نے غزل کو صرف حسن وعشق کے مضامین تک محدود نہیں کیا بلکہ تصوف ، اخلاق اور حقائق کو جگہ دی۔ اور غزل کی دنیا اور وسیع کر دی۔ غالب کی طرح مومن بھی باکمال شاعر گزرے ہیں۔محبوب سے مخاطب ہونے کا انداز بالکل نیا تھا۔ غالب، مصحفی تو نہیں تھے مگر انہوں نے نئے نئے مضامین کو داخل کیا۔ فرسودہ مضامین کو اپنی حدت بیان سے نیا کرکے پیش کرتے ہیں ان کے کلام میں شاعری کا تمام حسن موجود ہے۔جو کم شاعروں کو نصیب ہوا۔

ذوق نے غزل کے ساتھ قصیدہ میں بھی اپنا نام روشن کیا۔ شاہ نصیر نے بھی غزل میں اپنا نام کمایا۔داغ دہلوی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں ان کی زبان صاف ستھری اور شائستہ بھی ہے انہیں اس بات کا فخر بھی تھا۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

اردو دیگر شعراء میں بہادر شاہ ظفر، امیر مینائی، شیفتہ ، سالک اور تسکین وغیرہ ممتاز مقبول ہیں۔حالی اور آزاد نے نیچرل شاعری کا آغاز کیا۔ پھر تو غزل گوئی کی رونق میں کمی آگئی دہلی اسکول کی غزل گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ قومی ملکی ، سیاسی، تاریخی اور ادبی اس طرح کے موضوع پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ ان شعراء میں نظیر اکبر آبادی،

آزاد، حالی، اقبال، اکبر، چکبست، جوش، فیض، سلیم اور مولوی اسمٰعیل میرٹھی قابل ذکر ہیں۔

حقیقت نگاری، اختصار، سنجیدگی، سادگی اور سلاست دہلوی شاعری کے نمایاں رنگ ہیں۔ جذبات کے اظہار میں عام طور سے بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ جذبات نگاری ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔معاملات عشق میں تہذیب کا رکھ رکھاؤ ہے۔غم جاناں اور غم دوراں دونوں نظر آتے ہیں۔ فارسی تراکیب سے زبان اور غم دوراں دونوں نظر آتے ہیں۔ فارسی تراکیب سے زبان کو آراستہ کیا گیا ہے۔تصوف اور اخلاقی مضامین جگہ جگہ ملتے ہیں۔حسن اور نزاکت کا ایسا استعمال اثر دل پر ہوتا ہے۔

ویسے تو اردو شاعری کی نشو ونما میں مختلف جگہوں کا ہاتھ رہا ہے، دہلی ،لکھنؤ، عظیم آباد، حیدر آباد مگر مرکزیت دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کو حاصل ہوئی۔اہل زبان ہونے کا دعویٰ بھی یہیں کے لوگوں کا ہے۔اور یہیں کے لوگوں کی زبان کو ٹکسالی کیا گیا۔ لہٰذا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شعرو شاعری کی تعلیم و تربیت کے دو ہی اسکول تھے بعد میں راسخ اور شاد عظیم آباد نے۔عظیم آباد میں ایک جدید اسکول کی بنیاد ڈالی تھی تو بھی مگر اس کو ترقی اور مقبولیت نہیں مل سکی۔

دہلوی شاعری اپنی معنوی حیثیت اور انداز بیان کے اعتبار ہے جو انسانی زندگی کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہنے والی ہے سچی محبت کی روحانی وارداتیں انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں اس لیے دہلویت اردوشاعری میں ایسی کیفیت ہے جو ہمیشہ لطف دینے والی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور نئے رنگ و روپ اور نئے انداز بیان کے ساتھ ساتھ اردو شاعری خصوصاً غزل گوئی کے مزاج کی خاص پہچان ہے۔

☆☆☆

دبستانِ لکھنؤ

لکھنؤ کی شاعری نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ دہلی کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ برہان الملک اور شجاع الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ کی سلطنت کے قاعدے اور ضابطوں میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ جس کے زیر اثر نوابوں نے امیروں اور سرداروں کو جاگیریں بانٹنا شروع کر دی تھیں۔ لکھنؤ کی فارغ البالی سکون اور راحت کی اس فضا نے دوسرے علاقے کے فنکار شاعر اور ادیب لکھنؤ میں آکر بسنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب دہلی اجڑ چکی تھی چنانچہ شاعر اور ادیب اودھ کو اپنی منزل سمجھ رہے تھے۔ یہاں ہر طرف بے فکری اور خوشحالی کا دور تھا۔ اس کے نتیجے میں آرام طلبی اور عیش پرستی عام ہوگئی تھی۔ اس پر مزید اضافہ لکھنؤ والوں کے مزاج نے کیا انہیں اپنی بڑائی اور برتری کا پورا احساس تھا۔ ظاہری خود پرستی نے لکھنؤ والوں کو ایک خاص رنگ دیا۔ جس میں نفاست، تکلف، بناوٹ اور ان کی نجی زندگی میں ان کی مختلف شکلیں نظر آتیں۔ ان کی زبان اور لب و لہجے میں نرمی اور شائستگی اور لباس اور غذا میں وہی تکلف تھا۔ یہ خصوصیات ان کے مزاج اور ان کے اثرات زبان اور ادب پر بھی نمایاں طور پر ہونے لگیں۔ اہل لکھنؤ کو اپنی زبان اور تہذیب پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے مقابلے میں دوسرے کو کم تر سمجھتے تھے زبان کے سلسلے میں انہوں نے یہ کہا کہ بہت سے وہ الفاظ جواب تک رائج تھے انہیں متروک کر دیئے۔ اس سلسلے میں ناسخ کی اصلاحی خدمات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ انہوں نے زبان کی تشکیل اور تعمیر میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے۔ ''ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا بانی کہا جاتا ہے اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی اور

لکھنؤ کے فرق اور امتیازات کو سب سے پہلے ناسخ نے متعین کیا اور ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا۔"

لکھنؤ کی شاعری میں جو امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں انھیں ہم مختلف عنوان کے تحت اس طرح بیان کرا سکتے ہیں۔ لکھنؤ شاعری میں محبوب کا جو تصور ملتا ہے اس سے اس کی صنف کا تعین ہوتا ہے۔ اب تک اردو شاعری میں محبوب کا تذکرہ عام طور پر مذکر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے لکھنوی شاعری میں محبوب کو نہ صرف جنس سے پہنچانتے ہیں بلکہ اس کے لباس اور آرائش کے سامان کا ذکر اس کے حسن کے ساتھ کیا جاتا ہے چونکہ لکھنؤ کا ماحول اور وہاں کی تہذیبی زندگی میں عورت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

افشاں پہلی بار میں بالوں پر ہے چنی
چھٹکی ہوئی چاندنی زلفیں سیاہ ہیں

محو انجم کو تو نے سب کی نظروں سے اتارا ہے
قیامت کا مدانی کا ڈوپٹہ چاند تارا ہے

اردو غزل میں معاملہ بندی ایک اہم موضوع ہے اس سے عاشقانہ جذبات کی مختلف منزلوں کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں وصل اور ہجر کے نشاط و کرب کے ساتھ عاشقانہ جذبات سے متعلق دیگر احساسات ہوتے ہیں جس میں ماضی کی یادیں اور حال کی کیفیت شامل ہوتی ہیں۔ غزل گو شاعر لطف کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اگرچہ معاملہ بندی کی ابتدا دہلی میں ہوچکی تھی۔ لیکن اس کا فروغ انہیں شاعروں کے ہاتھ لکھنؤ میں ہوا۔ معاملہ بندی کی ابتدا جرأت نے دہلی سے آکر لکھنؤ میں کی تھی۔ اگرچہ اس کی مثالیں دہلوی شعرا خصوصاً مومن اور داغ کے یہاں ملتی ہیں۔ جو لکھنوی شاعری کی اہم اور خاص جز ہے۔ یہ لوگ جب ان موضوعات پر خیال آرائی کرتے ہیں تو ان کے یہاں حقیقت پسندی کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔

یہ ہم سے صبح شب وصل شوخیاں کیسی
اس اپنی رات کی شرم و حیا کو یاد کرو

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصے پر پیار آتا ہے

دست رنگیں وہ رکھ کے سینے پر
آگ سی سینے میں لگاتے جاتے ہیں

مضمون آفرینی اور الفاظ مرصع کاری پر لکھنوی شعراء کی خاص نظر تھی۔ آتش لکھنوی جو کہ ایک طرح سے لکھنؤ اسکول کے بانی کہے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کو مرصع سازی سے تعبیر کیا ہے۔ لکھنوی شعرا کی نقل میں دہلی ولوں نے بھی بندش الفاظ کا خیال رکھا ہے۔ لیکن ان کی یہاں وہ نزاکت اور نفاست نہیں ہے جو لکھنوی شاعری میں ملتی ہے۔

اگر دیکھوں تو آفت ہو نہ ہو دیکھوں تو قیامت ہو
غرض دونوں طرح سے ایک نہ ایک الزام آتا ہے

یہ کیا ہے ایک ہی گردن پر خوں سارے زمانے کا
کوئی نغمہ چھیڑے پہلے تمہارا نام آتا ہے

لکھنوی شاعری میں تمثیلی پیرائے بیان جیسے منطقی تخیل بھی کہا جاتا ہے جہاں شاعر پہلے مصرعے میں خیال یا دعویٰ پیش کرتا ہے اور دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے
تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

آزاد غزل میں آتش کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو شاعری میں میر و غالب اور مومن سے کم مگر ناسخ سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔ واقعیت اور خارجیت کا امتزاج ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں رند، صبا، نسیم، نواب مرزا شوق اور آغا وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

نمونہ کلام:

کسی کی محرم آب رواں کی یاد آتی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

مومنؔ اور غالبؔ ایسے شاعر ہیں جن کا تعلق دہلی اسکول کے ساتھ ساتھ لکھنؤ اسکول سے بھی ہے۔ جنہوں نے فرسودہ مضامین کو الگ کر کے اردو شاعری کو نئے سازو سامان سے مالا مال کیا۔ ان کے یہاں خوبصورت تشبیہات و استعارات، مضمون آفرینی حدت طرازی، فصاحت و بلاغت موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیان اور

یا مومنؔ کا وہ شعر جس کے لیے غالب اپنا پورا دیوان قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غدر کے بعد جدید نظم وجود میں آئی جس کے بانیوں میں حالیؔ اور آزادؔ کا نام سرفہرست ہے۔ دیگر اصناف میں مثنوی اور مرثیہ نے بھی ترقی کی۔ شاعری کے ساتھ زبان کو بھی بے حد فروغ ملا۔ اور لکھنؤ میں غزلوں کے ساتھ ساتھ مثنویاں اور مرثیہ لکھے گئے۔ مثنوی کا شوق میر حسنؔ کی مثنوی کے بعد شروع ہوا۔ اور اس صنف کو اہم اصناف سخن میں شامل کر لیا۔ ناسخؔ کی ''نظم سراج'' لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی کہلائی۔ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ جو کہ آتشؔ کے شاگرد تھے، انہوں نے مثنوی کی طرف توجہ کی اور ''مثنوی گلزارِ نسیم'' لکھ ڈالی جو کہ ایک حیثیت کے ساتھ تسلیم کی گئی۔ نسیم کا یہ کارنامہ کہ مثنوی گل بکاؤلی کا دلچسپ قصہ جو کہ نثر میں تھا اسے نظم میں ڈھال کر اس میں مثنوی کے اوصاف پیدا کر دیئے۔ واقعہ نگاری اور مصوری کو پورے حق کے ساتھ بیان کیا۔ مرزا شوقؔ کی مثنوی ''زہر عشق'' کا بھی نام آتا ہے مگر اپنی حیثیت میں وہ مثنوی گلزار نسیم کا مقابلہ نہ کر سکی۔

وہ سبزہ خواب آرام جاگی مرغ سحر کے غسل سے
یعنی وہ بکاولی گل اندام اٹھی نکہت سی خوش گل سے
(نسیمؔ)

لکھنؤ میں غزل کا بول بالا زیادہ تھا۔قصیدے کا رواج نہیں کے برابر تھا۔چونکہ وہاں کے امراء وغیرہ کا تعلق شیعہ مذہب سے تھا۔ اس لیے شاہی دربار میں غزل کے ساتھ مرثیوں کو بھی فروغ ملا۔ اور شعرا میں اس صنف کو زندہ جاوید بنادیا۔ ان میں سوداؔ، مسکین ، میر ضاحک، میر حسن کے بعد میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ قابل ذکر ہیں۔ کچھ دنوں تک یہ فن پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا مگر بعد میں انیسؔ اور دبیرؔ نے خون جگر سے سینچا اور پسندیدہ صنف میں تبدیل کر دیا۔ دونوں شاعروں کا بڑا نام ہوا اور مرثیہ جیسی صنف کو ترقی ملی۔ اور یہ اپنے فن کے بادشاہ کہلائے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد نفیس رشید، وحید، اوج، اور تعشق مرثیہ گوئی کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔

کیا نوجوان ہے شہ کے برادر کو دیکھو
سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھو

ہوگا کبھی نہ حسن ملک کا نہ حورکا
جلوہ ہے اس جری میں محمد کے نور کا
(انیسؔ)

گرتے ہی خاک پہ شہ دیں کو غش آگیا
پھر بھی نہ کوئی پیاسے کو پانی پلایا گیا

خنجر لگا گیا کوئی نیزہ لگا گیا
کھولی جو آنکھ شہ نے جگر تھرتھرا گیا

مرثیہ میں شاعری کے تمام عنصر موجود تھے جو جدید شاعری کے لیے ضروری تھے۔ مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلیٰ جذبات ، سلاستِ بیان، تشبیہات، تخیل اور منظر نگاری وغیرہ وغیرہ اس وجہ سے نیچرل شاعری کو بہت ترقی ملی۔ مرثیہ گوئی نے شاعری کے میدان کو وسیع کرتے ہوئے اس کی مزید ترقی میں ہاتھ بٹایا۔ جو مرثیہ نگار بہت مشہور ہوئے ان میں میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ قابل ذکر ہیں۔

اودھ کا اقتدار ختم ہونے سے اس فن کی ترقی میں کمی ہوگئی۔ ناسخ اور وزیر کی مضمون آفرینی غالب اور مومن کی نمایاں خوبیاں بھی کم ہوگئیں۔ پھر سے لوگ غزل کی طرف راغب ہوگئے۔ اکبر، جلال، تسلیم، جیسے شعرا پیدا ہوگئے۔ دور جدید میں ہر طرح کی نظمیں لکھی گئیں جس میں مذہبی، سماجی، ملکی، تاریخی، سیاسی وغیرہ وغیرہ ان نظموں میں منظر نگاری اور تخیل خاص کر دیکھا گیا۔ حالی اور آزاد اس کے بانی تھے۔ بعد میں اسے نظم نگاروں کی لمبی تعداد نظر آئی اکبر، اقبال، چکبست، جوش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بال و پر نہیں
(حالی)

خام ہے جب تک کہ ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہوجائے تو ہے شمشیر سے زنہار تو
(اقبال)

حسرت نے غزل میں رنگ قدیم کے ساتھ جدید رنگ کی آمیزش سے ایک نئی دلکشی اور خوبی پیدا کردی۔ جوش نے نعرہ انقلاب پیدا کرکے، فانی نے نامرادی اور مایوسی، اصغر نے بیان پاکیزگی اور طہارت، جگر نے اپنے والہانہ پن سرشاری سے ایک نئی زبان عطا کی۔

بیسویں صدی میں غزل میں بھی جدید اور قدیم رنگ ملتے سے ایک نئے طرز کی غزل گوئی رائج ہوئی۔ ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری قدیم طرز کے شاد، صوفی، حسرت، عزیز، جوش، چکبست، اکبر، اصغر، جگر مراد آبادی اور فراق جدید رنگ سے شعرا میں بہت مقبول ہوئے۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہر اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے نایاب ہیں
(جوش)

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
(حسرتؔ)

بقا کہتے ہیں جسکو وہ مرا احسان ہے فانی
وہ حادث ہوں کہ دنیائے قدیم بھرتی ہے دم میرا
(فانیؔ)

لکھنؤ کی طرزِ بیان میں سادگی کی کمی ہے تصنع زیادہ ہے رعایتِ لفظی کی زیادتی ہے معاملہ بندی کا دور دورہ ہے۔ سنجیدگی کی کمی ایسی شاعری میں دل پر اثر پڑتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی کمی ہے۔ وہ روح نظر نہیں آتی جو دہلی کی شاعری کا خاص جز ہے۔ تمثیلی بیان زیادہ ہے حسن کے ساتھ ہوس پرستی بھی نظر آتی ہے۔ نسوانی زبان اور محاورات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ محبوب کے سراپا، لباس اور طرز معاشرت کا ذکر غیر مہذب اور عریانیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خیالات سے زیادہ الفاظ پر زور دیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کا استعمال کیا گیا۔ فن مرثیہ نگاری کو ترقی ملی۔ سید وقار عظیم نے لکھنوی دبستان شعر کی یہ خصوصیات قرار دی تھی۔

''تکلف اور تصنع محسوسات کی سادگی اور واردات کی سچائی کے بجائے خیال کی رنگینی اور فکر کی باریکی لفظی صنعت گری دوراز کار استعارے اور تشبیہیں، سخت اور سنگلاخ زمینیں، پر شکوہ الفاظ اور تراکیب دل کے بجائے دماغ سے تخاطب لب و لہجہ میں ایک طرح کا ہلکا پن جو بار بار بدمستی، ہوسنا کی اور عریانی پر منتج ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے باعتبار زبان کے لکھنوی شاعری کی حسب ذیل خصوصیات گنوائی ہیں:

(الف) عربی فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال۔

(ب) قافیہ پیمائی یعنی تمام قافیوں کو ختم کر دینے کے خیال کے باعث غزلوں کی طوالت۔

(ج) رعایت لفظی، ضلع جگت مراعاۃ النظیر کی کثرت۔

(د) مقفیٰ مرصع اور رنگین بندش اور اس کی بلاغت پیدا کرنے کی کوشش۔

(ر) تشبیہ و استعارہ میں پیچ دار باریکی۔

(س) محاورات و الفاظ صرف ان کی نشست دکھانے کے لیے استعمال کرنا۔

(ص) ابتذال اور عریانی۔

منشی وجاہت حسین جھنجھانوی نے دونوں مقامات کے معنوی اور لفظی خصوصیات کا احاطہ اس طرح سے کیا۔

دہلی _____ اردو معلیٰ، فصاحت، سادگی سلاست آہ۔

لکھنؤ _____ اردو معلیٰ بلاغت رنگینی رعایت لفظی واہ

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اسے اور واضح شکل میں پیش کیا۔

دہلی _____ (معنوی حیثیت سے) روحانیت یعنی واردات قلبیہ فلسفہ و تصوف ہجر نصیبی انفرادیت احساس۔

(لفظی حیثیت) سادگی، صفائی، روانی، فصاحت متانت شگفتگی گھلاوٹ فارسی تراکیب۔

لکھنؤ _____ (معنوی حیثیت) خارجی مضامین خصوصاً عورتوں کے سراپا زیور اور ملبوسات کے متعلق تمثیلیت مضمون بندی ابتذال۔

(لفظی حیثیت) قافیہ پیمائی، رعایت لفظی، لذت سازی غرابت خوبی بندش وغیرہ۔

ویسے تو اردو شاعری کی نشو ونما میں مختلف جگہوں کا ہاتھ رہا۔ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، حیدر آباد، مگر مرکزیت دہلی اور لکھنؤ اسکول کو ہی ملی۔ اہل زبان ہونے کا دعویٰ بھی یہیں کے لوگوں کا ہے اور یہیں کے لوگوں کی زبان کو ٹکسالی کہا گیا۔ لہٰذا ثابت ہو جاتا ہے کہ شعر و شاعری کی تعلیم و تربیت کے دو ہی اسکول تھے بعد میں راسخ اور شاد نے عظیم آباد میں جدید اسکول کی بنیاد ڈالی تو تھی مگر اس کو ترقی اور مقبولیت نہیں مل سکی۔

☆☆☆

اردو شاعری کا ارتقاء

شاعری اور زندگی کاتعلق:

شعر و ادب فن کار کے ذاتی مشاہدات اور احساسات سے وجود میں آتے ہیں۔ بالواسطہ طور پر یہ ایک سماجی عمل بھی ہے کیونکہ شاعر خلاء میں زندگی نہیں گزارتا۔ نہ وہ کوئی تارک الدنیا سوتا ہے اور نہ سنیاسی بلکہ وہ عام انسانوں کی طرح اس دنیا کا باشندہ ہوتا ہے ۔دنیا کے نوحہ غم اور نغمہ شادی میں وہ بھی عام انسانوں کی طرح شامل رہتا ہے اس کی شاعری اس کے محسوسات کا عکس اور ان پر اس کے ردِعمل کا اظہار ہوتی ہے نیز اس کو اس سماج میں اس دور کے رجحانات کا پسند نا پسند کا بھی کسی حد تک خیال رکھنا پڑتا ہے جو اس کا مخاطب ہوتا ہے ۔کیونکہ ہر شاعر میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ماحول سے قطعاً لاپرواہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر کے خیالات و تصورات اس کے موضوعات الفاظ و محاورات اور پیرایہ بیان سب کچھ اس کے زمانے اور ماحول کے پروردہ اور اس سے ماخوذ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غیر متمدن قوموں کی شاعری متمدن قوموں سے ، غلام قوموں کی شاعری آزاد قوموں سے اور مغربی اقوام کی شاعری مشرقی اقوام کی شاعری سے موضاعات اور انداز بیان ہر لحاظ سے مختلف ہوتی ہے یہ فرق موجودہ زمانے میں بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ آج سائنسی ایجادات اور رسل و رسائل کے جدید ذرائع کی وجہ سے دنیا بہت سمٹ گئی ہے اور اب دنیائے ایک سرے پر جو تحریکیں اور تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں دوسرے سرے پر رہنے والے بھی ان سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اب سے چند صدی پہلے جب انسان فاصلوں میں مقید تھا اور زندگی چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں بٹی ہوئی تھی اس وقت کسی کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس شہر سے باہر کیا ہورہا ہے۔ اس وقت انسانوں نے سوچنے کا دائرہ اور شاعری کے موضوعات بھی محدود تھے مختصر یہ کہ سماج اور زندگی کے رشتہ سے انکار کرنا حقیقت کو جھٹلانا ہے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھا جاسکتا نہ شاعر کے ساتھ انصاف ہوسکتا ہے۔

اردو شاعری کا سماجی اور سیاسی پس منظر:

ہندوستان میں مغل حکومت کا زوال اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء سے شروع ہوتا ہے ۔اورنگ زیب سے محمد شاہ تک بارہ سال مختصر عرصہ ہے جس میں سات بادشاہ تخت پر بٹھائے اور اتارے گئے ۔ان میں سے بعض کا زمانہ حکومت چند سال تک محدود تھا اور بعض کا چند ماہ تک محمد شاہ جس کو تاریخ میں رنگیلا کے بدنام لقب سے یاد کیا گیا ہے اس کو قسمت سے تیس سال کا طویل زمانہ حکومت نصیب ہوا۔ اور اسی لیے مغل حکومت کی بربادی تباہی میں جو حصہ اس کا ہے وہ اس کے پیش رووں میں کسی کا بھی نہیں اسی کے زمانے میں ہندوستان پر نادر شاہ کا حولناک حملہ اور ابدالیوں کا حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں مرکز کی طاقت کمزور پڑ گئی۔خزانہ خالی ہوگیا اور کتنے ہی لائق اور بہادر لوگ جنگ میں کام آگئے۔ مرکز کی کمزوری بادشاہ کی نااہلی اور درباری سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ متعدد ریاستوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا خزانہ کی آمدنی میں نمایاں کمی ہوگئی۔ مگر بادشاہ اور امراء کی رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہیں آیا ملک کا روپیہ بجائے فلاحی کاموں میں خرچ ہونے کے بادشاہ اور امراء کی عیاشیوں میں صرف ہونے لگا ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی سکون ختم ہوگیا۔ اخلاقیو روحانی پستی اور مادی نقطۂ نظر عام ہوگیا۔ مذہب کی روح ختم ہوکر گئی۔ اس کی جگہ بدعت اور رسم پرستی آگئی۔ روحانیت کی جگہ تن پروری اور آرام و آسائش مقصد زندگی بن گئے۔ آرام پسندی اور تن پروری نے جسموں کو محنت کے اور ذہنوں کو غور وفکر کے قابل نہ رکھا تھا۔ شراب ونغمہ روں امراء کی زندگی بن گئے تھے۔ پورا معاشرہ تیزی سے پستی کی جانب رواں تھا۔ گویا مغلوں کے آخری دور کا معاشرہ تیزی سے پستی کی جانب رواں تھا۔ گویا ''شمشیرو سناں'' کو چھوڑ کر ''طاؤس ورباب'' میں الجھ گیا تھا۔ اور یہی زمانہ اردو شاعری کی ترقی وترویج کا زمانہ بھی ہے۔ اس

لیے ظاہر ہے کہ اس میں بھی وہ خصوصیات پیدا ہونا ناگزیر تھا جو اس زمانے کی زندگی کی لازمی خصوصیات تھیں قدیم اردو شاعری میں جو محدود موضوعات فرار کی ذہنیت، عشق و محبت کا ایک مخصوص تصور، تصوف میں پناہ تلاش کرنا اور اظہار مطلب کے پیچیدہ اور پر تصنع طریقے ایہام وغیرہ نظر آتے ہیں وہ سب اپنے مخصوص حالات کا نتیجہ ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اردو شاعری کا آغاز دکن میں شروع ہوا قلی قلب شاہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔ (صاحب دیوان شاعر)۔ چونکہ اہل علم تھا اس لیے ایسے لوگوں کا اکرام کرتا تھا۔ انعام وغیرہ دلوانے میں پیش پیش تھا۔ قلی قطب شاہ کے خاندان میں تین اور بادشاہ گزرے جو شاعر بھی تھے۔ دکن کے تین ادیب وجہی، ابن نشاطی اور غواصی۔ جنہوں نے قصے کہانیاں لکھیں بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے گیتوں کی ایک کتاب لکھی نورس کے نام سے جس میں برج بھاشا اور شمالی ہند کے الفاظ شامل ہیں۔ اورنگ زیب نے جب شمال اور جنوب پر قبضہ کر لیا اسی دور میں اردو شاعری نے بہت ترقی کی۔ غزل مثنوی قصیدے مرثیے اور مذہبی ادب بڑی تعداد میں شائع ہوا۔ اس دور میں داخل ہونے تک دکنی اردو ایک بڑی اور مضبوط زبان بن کر ابھری جس کا رسم الخط فارسی تھا اس وقت تک اردو کو ہندی کہا جاتا تھا۔

جب دکن اور شمال دونوں مغل حکمرانوں کے قبضے میں آگئے۔ شاعروں نے فارسی چھوڑ کر اردو میں ہی لکھنا شروع کر دیا۔ دکن کے مشہور شاعر ولی دکنی جن کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے انہوں نے غزل مثنوی اور نظم پر اپنی طبع آزائی کی۔ ولی پہلے غزل گو شاعر ہیں ان کی عظمت کا اعتراف میر تقی میرؔ نے ریختہ کا مسلم الثبوت استاد کہہ کر کہا۔ محمد حسین آزاد نے انہیں اردو شاعری کا باوا آدم کہا۔ اس وقت کے شعراء نے انی اشعار کے ذریعہ ولی کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ
(شاہ حاتم)

آبرو شعر ہے تیرا اعجاز
پر ولی کا سخن قیامت ہے
(آبرو)

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا
(میر تقی میرؔ)

جب ولؔی دہلی آئے تو ان کی تقلید میں دہلی کے شعراء فارسی چھوڑ کر اردو میں شاعری کرنے لگے۔ ولؔی کی شاعری غزل کی شاعری ہے چونکہ غزل میں حسن و عشق سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات کی رنگارنگ کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ ولؔی کے یہاں بھی حسن و عشق کی یہی جلوہ گری ہے۔

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

لب پر دلیر جلوہ گر ہے جو خال
حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے ہلال
جسے عشق کی تیرہ کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولؔی کے بعد دکن میں شعر و ادب پر کام ہونے لگا اور دہلی میں بیدل خان آرزو وغیرہ کے بعد فائز دہلوی آبرو، یک رنگ، شاکر ناجی اور حاتم جیسے شاعروں نے اپنی جگہ بنائی صوفیانہ شاعری زیادہ ہوتی تھی اردو پر ابھی تک ہندی اور دیسی بولیوں کا اثر تھا مرزا مظہر جان جاناں اور حاتم نے ہندی کے ناگوار لفظ نکال کر اردو کی تراش خراش کی درباری اور سرکاری زبان ابھی ابھی فارسی تھی مگر اردو کو دھیرے دھیرے مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی اردو شاعری کو ریختہ کہا گیا (گری پڑی چیز)۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ دہلی پر احمد شاہ ابدالی ، نادرشاہ مراٹھوں جاٹوں روہیلوں سکھوں کے حملے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ جمایا۔دکن میں بنگال میں آزاد حکومت کا بول بالا ہوا یہی وہ دور تھا جب اردو نے ترقی کی مغلوں کی حکومت کمزور پڑنے سے فارسی کا غلبہ کم ہوگیا۔دلی کی شاعری میں ان حالات کا اثر پڑا میر تقی میرؔ، سوداؔ، دردؔ، نظیر اکبر آبادی کے یہاں اس وقت کا منظر نامہ بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس وقت کے شاعروں میں میرؔ ، سوداؔ ، میر دردؔ، میر سوزؔ ، قائم چاند پوری نے زیادہ تر غزلیں کہیں سوداؔ قصیدے کے بادشاہ کہلائے میر تقی میرؔ نے دہلی کے حالات پر ہجو لکھیں۔آج بھی میرؔ کی شاعری اپنی پوری تازگی اور شعریت کے ساتھ مقبول عام ہے کوئی تذکرہ نویس یا شاعر ایسا نہیں ملے گا جو میرؔ کے ''خدائے سخن'' ہونے سے انکار کرے ناسخ اور غالب کا عقیدہ ہے کہ ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں'' ذوق کو بہ حسرت رہی کہ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔'

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ تو خود بھی احساس تھے

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

کلام میرؔ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ میرؔ ایک حساس ، دردمند اور باشعور انسان تھے میر کا دیوان درد وغم کا ایک مجموعہ ہے میرؔ نے خود کہا

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
دردو غم کتنے کئے جمع تو دیوان کہا

نظیر اکبر آبادی نے بھی نظم نگاری میں اپنا کمال دکھایا۔انھوں نے ایک ایسی شاعری کی تخلیق کی جس کا رشتہ

عوام سے جمہوریت سے اور انسانیت سے تھا اگر ادب حقیقی معنوں میں سماج کا آئینہ ہے تو یہ تعریف نظیر کی شاعری پر پوری اترتی ہے۔ ان کی مشہور نظموں میں شہر آشوب ، بنجارہ نامہ، آدمی نامہ ، روٹی نامہ، ہولی ، دیوالی، بلدیوجی کا میلہ اور گرونانک بہت مشہور ہیں نظیر اکبر آبادی کی نظم بنجارہ نامہ کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

ٹک ہر حرس و ہوس کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جب دہلی کے حالات حد درجہ بگڑ گئے تنگی کا احساس حد سے زیادہ ہونے لگا بے روزگاری بڑھی تو دہلی سے لکھنؤ کی طرف لوگوں نے ہجرت کی اس میں شاعر بھی شریک تھے ۔لکھنؤ میں اس وقت نواب ''شجاع الدولہ'' کی حکومت تھی ہر طرف امن وسکون تھا خوشحالی تھی۔ میر تقی میرؔ سوداؔ اور میرؔ سوز وغیرہ لکھنؤ چلے گئے شجاع الدولہ نے ان شاعروں کو خوب نوازا۔اس وقت لکھنؤ میں مصحفی ، جرأت اور انشاء بھی دہلی سے لکھنؤ آکر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لکھنؤ کے ماحول میں خوشحالی عیش پرستی وغیرہ زیادہ تھی۔ اس کے وہاں کی شاعری اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ۔انشاء اور مصحفی کے معرکے مشہور ہیں۔ انشاء کی کتاب رانی کیتکی کی کہانی اور قواعد کی کتاب ''دریائے لطافت'' نے بہت مقبولیت حاصل کی انشاء اور جرأت نے ریختی ایجاد کی جس میں عورتوں سے اکثر پست اور فحش خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

دوسری طرف وہیں دیا شنکر نسیم نے ''مثنوی گلزار نسیم'' اور میر حسن نے مثنوی ''سحر البیان'' لکھی جو لکھنؤ کی زندگی کی حقیقی تصویریں ہیں مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' بھی اہم مقام کی حامل ہے لکھنؤ میں آتش، ناسخ جیسے شاعر بھی تھے۔ جن کی شاعری سنجیدہ اور معیاری بھی۔ اسی دور میں میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ جیسے فن کو اپنا کر اپنا لوہا منوایا۔

۱۸۲۵ء میں اردو سرکاری زبان بن گئی یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ رام پور حیدر آباد فرخ آباد اور عظیم آباد (پٹنہ) وغیرہ شہروں میں اردو کے شاعر و ادیب یکجا ہوگئے ۔دہلی میں اس وقت غالب، ذوق ، مومن کا چرچہ تھا۔

یہ دور اردو شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔غالب فلسفی تو نہیں تھے مگر انہوں نے زندگی کو بہت سے نکتوں سے روشناس کرایا غالب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی فکر ہے انہوں نے نئے نئے مضامین داخل کیے فرسودہ مضامین کو اپنی جدت بیان سے نیا کر کے پیش کرتے ہیں ان کے کلام میں شاعری کے وہ تمام محاسن موجود ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کر دیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور
غالب کے کلام کی شعریت ان کے کلام میں جھلکتی ہے

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش یار
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

مومن خاں مومن شاعری میں مقبول عام ہوگئی۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کی پسندیدگی آج بھی جوں کہ توں ہے لیکن خود غالب کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ فوراً کہہ اٹھے کاش کہ مومن میرا سارا دیوان لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔ مومن کا دور خود بڑے شاعروں کے جوہر دکھانے کا بہترین دور تھا۔ مگر اس میں بھی مومن نے اپنے گن کو بیحد مقبول بنایا، مگر شاعرانہ اور نازک خیالی کے علاوہ ان کی شاعری میں پائی جانے والی داخلیت نے انہیں صف اول کے شعراء میں نمایاں مقام دلایا۔ ذوق بھی اہم شاعروں میں ہیں بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی شاعر تھے ذوق سے اصلاح لیتے تھے۔ دوسری طرف داغ اور امیر مینائی پرانے طرز کی شاعری کر رہے تھے مگر مولانا حالی کی حقیقت پسند شاعری نے دوسری طرح سے رجوع کیا۔ حالی مبالغہ آرائی اور لفاظی کو پسند نہیں کرتے تھے مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں ''انجمن پنجاب'' قائم کی جہاں اردو نظموں

کے مشاعرے ہوئے تھے۔ اکبر اپنی ظریفانہ شاعری کے لیے مشہور تھے اقبال ایک قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ جدید نظم نگاری کی جہاں بات ہوگی اقبال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی نظمیں ایک تاریخی موڑ رکھتی ہیں اقبال نے زیادہ تر نظمیں ہی لکھیں جیسے قومی، وطنی، ملی تاریخی، دعائیہ نظمیں غرض کہ نظموں کے مختلف انداز کی شاعری جا بجا دکھائی پڑتے ہیں۔ غور طلب ہے کہ ان کی شاعری میں فکری عنصر بہت زیادہ حاوی ہے جس کو ہم فلسفہ طرازی کا نام دے سکتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں فلسفیانہ جذبات میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ جیسے شمع موج دریا سبز گذشت آدم، جگنو بچہ اور شمع، تحت، نوائے غم، فلسفۂ غم۔ انسان مکالمہ ارتقاء اور بزم انجم وغیرہ وغیرہ شبلی، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر اور جوش ملیح آبادی وغیرہ نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ انگریزی حکومت کی بغاوت کی فیض احمد فیض و مخدوم محی الدین ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، مجاز کیفی اعظمی نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری پریم دھون اور اسق جونپوری نے ترقی پسندی کو شاعری کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی اختر شیرانی، فراق گورکھپور اختر الایمان احمد فراز شاد، تمکنت کمار پاشی کلیم عاجز اور معین احسن جذبی نے ۱۹۶۰ء کے بعد شہرت پائی۔

ان کے بعد شہر یاد وحید اختر بزیش کمار شاد بلراج کومل یگانہ چنگیزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو میں نظم گوئی اب ابتداء اسماعیل میرٹھی اور محمد حسین آزاد کے ذریعہ انیسویں صدی میں ہوچکی تھی۔

دوسرے وہ شعراء جو دنیا کو خوشحال بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان میں شہرت فیض، مجاز جدیبی احمد ندیم قاسمی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح، مخدوم، جانثار اختر، اختر انصاری، وامق جونپوری، وجد حیدر آبادی، شمیم کرہانی، ساحر لدھیانوی کو حاصل ہوئی۔

نو عمر شعراء میں وحید اختر، وزیر آغا، خلیل الرحمٰن باقر مہدی، راہی، ابن انشاء، نریش کمار شاد، عبدالمتین عارف یہ سارے شعراء ہر دل عزیز ہیں کیونکہ موجود نسل کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھتے ہیں اور اپنی ساری قوت انسان کی بھلائی میں صرف کردینا چاہتے ہیں۔

اب ان لوگوں کی باری ہے جو پرانے راستوں کو چھوڑ کر نئی راہ بنانے کی خواہش مند تھے ان میں شرر اسمٰعیل میرٹھی عظمت اللہ خاں کے نام آتے ہیں، لیکن یورپ کی آزاد نظم گوئی سے متاثر ہوکر باقاعدہ ایک تحریک کی

شکل میں ابتداء ۱۹۳۶ء کے بعد ہوئی ان میں تصدق حسین خالدؔ، ن۔م۔ راشد، میراجی، الطاف گوہر، مختار صدیقی، اور سلام مچھلی شہری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری کی دیگر اصناف میں غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

اردو غزل ایک جائزہ

''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے'' (رشید احمد صدیقی)

یقیناً غزل ہماری اردو شاعری کا سب سے بیش قیمتی اور عظیم سرمایہ ہے اردو شاعری کا جہاں بھی ذکر ہوتا ہے غزل اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ رعنائیوں اوردلاویزیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ غزل میں کچھ ایسی کشش ہے، روانی ہے، بے ساختگی شیرینی ہے، جو ہر خاص و عام، امیر و غریب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

غزل میں ذات بھی ہے اورکائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے تمہاری بات بھی ہے

غزل نے اردو شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ شہرت اور مقبولیت کا تاج ہمیشہ اس کے سر پر رکھا گیا۔ اس نے ہر دور میں انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ غزل ہماری تہذیب وتمدن کی آئینہ دار بھی ہے اور ہمیشہ ہر دور میں وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی رہی ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی صاحب لکھتے ہیں:

''غزل اپنی ندرتِ فکر، جدتِ اسلوب اور حسن ادا کے اعتبار سے
عجیب و غریب صنف ہے۔ دوسری اصنافِ شعر اپنے اپنے وقت پر
ابھر کر تاریخی تناظر کے ساتھ نکھر کر سامنے آئیں لیکن وقت کے ساتھ

زوال پذیر ہوگئیں۔ صرف غزل ایسی صنف ہے، جس کی تصویروں اور تمثیلوں کا رقص فانوس کی طرح جاری رہا۔ اور ابتداء کو انتہاء سے اور انتہا کو ابتداء سے الگ کرنا مشکل ہوگیا۔ آج کی غزل صدیوں پہلے کی غزل سے مختلف ہے بہت کچھ آگے اور الگ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے غزل کے شعروں کی نسبت دل کی دھڑکنوں سے ہمیشہ قائم رہی ان کی اپنی لے اور لہر بظاہر کبھی نہیں بدلتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر لمحہ اس میں تبدیلی آتی ہے۔ انسان تجسس، تجربے اور تجزیے سے اس کا رشتہ کچھ ایسے لطیف تاروں کے ذریعہ جڑا رہتا ہے جو اسے لمحے لمحے کی خبر دیتے رہتے ہیں۔ اور اسی خبر اور اس سے پیدا ہونے والی نظر اثر اور تاثر سے دل کی دھڑکنوں کا زیروبم اور مدو جزر نئی نغمگی نئی صدا اور ان لطیف آوازوں سے آشنا ہوتا رہتا ہے جن کو تخلیقی حیثیت کہا جاتا ہے۔

غزل ہماری زندگی کی ترجمان ہے اور ان اشاروں اور کنایوں کے ساتھ ہے جو آبی دائروں کی طرح برابر تخلیق پاتے ہیں۔ اور دور تک پھیلتے رہے ہیں۔ اسی لیے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ غزل وقت کا ساتھ نہ دیتی ہو تا نہ دے سکتی ہو۔ وہ بھی زندگی کی طرح اپنا ورق پلٹی ہے۔ لیکن کتاب حیات کی شیرازہ بندیوں کے سلسلے کو منقطع نہیں ہونے دیتی اس معنی میں اس کی تاریخ کا تحرک اور تسلسل غیر معمولی ہے۔"

غزل کے لغوی معنی ہیں محبوب سے باتیں کرنا۔ یعنی عشقیہ اور رعنائی شاعری غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق کا افسانہ ہو، گل و بلبل، کا ذکر ہو تصوف اخلاق، فلسفہ، وغیرہ سے متعلق مضامین ہوں اور ہر شعر کا مضمون الگ ہو۔ غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے اس کو مطلع کہتے ہیں اگر ایک کے بعد دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسن مطلع کہتے ہیں باقی اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر میں

شاعر کا تخلص ہوتا ہے اس کو مقطع کہتے ہیں۔ جیسے میر تقی میرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ وغیرہ۔

غزل اپنے تاریخی پس منظر کی بنا پر صرف عورتوں سے باتیں کرنا پر ہی موقوف نہیں ہے۔ اس میں شروع سے ہی عشق و عاشقی کے مضامین کے ساتھ ساتھ۔ رندانہ خمریانی بہاریہ، وصف، فکری، تصوری، اخلاقی مضامین بھی شامل ہیں۔

ویسے تو غزل کا دامن بہت وسیع ہے اس میں کئی موضوع کے تحت مضامین قلمبند کیے جاتے ہیں لیکن جہاں تک اس کے بنیادی موضوع کا تعلق ہے اس میں عشقیہ شاعری، خمریات، اور تصوف خاص ہیں۔ غزل ہمارے اظہار خیال کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے اس کے دامن میں وسعت ہے اس کی ابدیت کے لیے کافی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پورے معنی رکھتا ہے بڑی بڑی باتیں بہت سے اہم نکتے بڑی آسانی سے ایک شعر میں کہہ دیئے جاتے ہیں۔

غزل کے سب سے پہلے نمونے ہمیں امیر خسرو کی غزل کے مطلع میں نظر آتی ہے جو ان سے منسوب کی گئی۔

زحال مسکین مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں

چوں تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہوکا ہے لگائے چھتیاں

کبیر داس ایک پائے کے صوفی اور با کمال شاعر گزرے ہیں ان کے یہاں بھی غزلیں دیکھنے کو ملیں۔ اکبر و جہانگیر کے زمانے میں بھی غزلیں لکھی گئیں۔ باقاعدہ طور پر شاعری کا چلن دکن میں ہوا جس کا سہرا قلی قطب شاہ کے سر ہے اس نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے اس کے علاوہ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل ثانی قابل ذکر ہیں۔ ان بادشاہوں کے زمانے میں وجہیؔ، غواصیؔ، قاضی محمودؔ، بحریؔ، نصرتیؔ، شاہیؔ اور شوقیؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جب شمالی ہندوستان میں باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز ہوا، اس سے قبل دکن میں سیکڑوں شاعر پیدا ہوگئے تھے۔

قلی قطب شاہ کے بعد دکن کا سب سے بڑا با کمال شاعر ولیؔ دکنی گزرا ہے۔ شروع میں ان کی شاعری پر

دکنی اثرات تھے بعد دہلی آنے پر ان کی زبان میں تبدیلی آگئی تھی۔اس دور کے دوسرے شاعر سراج الدین علی خاں آرزو آبرو، ناجی یک رنگ قزلباش خاں امید اسد یار خاں انشا مرزا معزر فطرت اور مرزا مظہر جانِ جاناں، اس زمانے کی خصوصیات شعری ایہام گوئی اور ریاعت لفظی ہیں۔

شمالی ہندوستان کے شعراء میں مسرف الدین مضمون ، نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، حسن علی شوق ، شہاب الدین ثاقب، نواب صدر الدین محمد فائز دہلوی ، شیخ ظہور الدین قائم اور شاکر ناجی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔دہلی میں جب شاعری کی ابتداء ہوئی شاہ جانم نے محاوراتی الفاظ کو دور کرنے کی کوشش کی ،مظہر جان جاناں نے ایہام گوئی کو ترک کیا۔

اس کے بعد اس دور کے مشہور شاعر سوداؔ، میر تقی میرؔ ، میر سوزؔ ، میر حسنؔ ، یقینؔ اور بیانؔ ہیں۔ قائمؔ چاند پوری ہیں ، میرؔ تقی میر کی شاعری آج بھی اپنی پوری تازگی اور شعریت سے مقبول عام ہے۔کوئی تذکرہ نویس یا شعر ایسا نہیں ملے گا جو میرؔ کے ''خدائے سخن ہونے سے انکار کرنے ناسخؔ اور غالب کا عقیدہ ہے کہ ''آپ سے بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں'' ذوق کو یہ حسرت رہی کہ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب یا غالبؔ کہتے ہیں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میر کو خود بھی احساس تھا۔

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

میرؔ ایک حساس ، دردمند اور باشعور انسان تھے۔ میرؔ کا دیوان درد وغم کا ایک مجموعہ ہے۔ میرؔ نے خود کہا۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کی صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میر دردؔ کا شمار صوفی شاعروں میں ہوتا تھا۔

بعد کے شعراء نے غزل کی ترقی میں کوئی اضافہ نہیں کیا مصحفی اثر، انشاء، جرأت اور رنگین کے یہاں زبان و بیان کی وہی خوبیاں موجود تھیں جو اس کے پہلے شعرا کے یہاں پائی جاتی تھیں۔

غزل کے لیے انیسویں صدی کا دور بے حد اہم ہے۔ بلکہ ایک طرح سے انقلاب کا دور ہے۔ دہلوی شاعری کی خوبیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لکھنؤ شاعری کی خوبیاں حاوی ہوگئیں۔ شاعری میں زبان کی اصلاح کا خاص خیال رکھا گیا۔ اس زمانے کے مشہور شعراء میں نصیر دہلوی ناسخ لکھنوی، انش لکھنوی قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ کا زمانہ آتا ہے جو آج بھی غزل کا سب سے بڑا سرمایہ ہے غالبؔ نے زندگی کے اہم نکتوں سے روشناس کرایا۔ ان کی فکر اور فلسفیانہ سوچ قابلِ تعریف ہے۔ قدیم طرز سے ہٹ کر ایک نئی راہ متعین کی فرسودگی سے پرہیز کیا۔ ان کے کلام میں وہ حسن اور دلآویزی موجود ہے جو دوسرے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتی۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ذوقؔ کے کلام میں خارجیت اور تصنع ہے۔ مومنؔ نے غزل کو ایک نیا انداز بخشا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر میں پسندیدگی آج بھی قائم ودائم ہے۔ غالبؔ کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ فوراً کہہ اٹھے کے کاش کہ مومنؔ میرا سارا دیوان لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔ مومنؔ کا دور خود بڑے شاعروں کے جوہر دکھانے کا بہترین دور تھا۔ مگر اس میں بھی مومنؔ نے اپنے فن کو بے حد مقبول بنایا۔ مگر شاعرانہ اور نازک خیالی کے علاوہ ان کی شاعری میں پائی جانے والی داخلیت نے انہیں صف اول کے شعراء میں نمایاں مقام دلایا۔

داغؔ دہلوی اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ وہ ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی زبان صاف ستھری اور شائستہ تھی انہیں اس بات کا فخر تھا۔

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اس دور کے دوسرے شعراء میں بہادر شا ظفر، منشی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، حکیم ثناءاللہ فراقؔ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ حالات نے کروٹ لی غدر کا واقعہ ہندوستان کی تاریخ میں نیا موڑ رکھتا ہے۔ شاعری اس سے الگ کہاں تھی اس نے بھی اثرات قبول کیے غزلوں سے لوگوں کا رجحان ہٹا حالات کچھ ایسے تھے، مولانا محمد حسین آزاد حالیؔ شبلیؔ کا اسمٰعیل میرٹھی اور نظم طبا طبائی وغیرہ نے ایسی نظمیں لکھیں جس میں وطنیت کا جذبہ پوری طرح حاوی تھا۔ اور یہ غزل کا موضوع نہیں تھا۔ حالیؔ نے غزل کی اصلاح کی طرف توجہ کی بہت سے طریقے بھی بتائے۔

مگر ان حالات کا کچھ خاص اثر غزل سے قبول نہیں کیا داغؔ اور امیرؔ کی غزلیں مشہور ہوئیں۔ بعد میں غزلوں میں ایک نیا پن آیا۔ اقبالؔ، چکبستؔ اور جوشؔ کی شاعری نے بھی لوگوں کو متاثر کیا۔ دوسری طرف حسرتؔ موہانی، عزیزؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی، سیمابؔ اکبر آبادی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مراد آبادی، فراقؔ گورکھپوری، شادؔ عظیم آبادی، یگانہؔ چنگیزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حسرتؔ موہانی اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے جانے جاتے ہیں مگر ان کی شہرت کا دارومدار ان کی غزل گوئی ہے وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

عشق حسرتؔ کو ہے غزل کے سوا
نہ قصیدے نہ مثنوی سے غرض

دوسری جگہ اس طرح سے کہتے ہیں۔

لکھتا ہوں مرثیہ نہ قصیدے نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف میری جان عاشقانہ

حسرتؔ موہانی نے ایسے وقت میں اردو غزل کو عزت دلائی اس میں جان ڈالی جبکہ عام طور سے لوگ غزل

سے بیزاری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اردو غزل کو پستی سے نکالا اس کو نیا لب و لہجہ عطا کیا جس میں گھٹن یا اکتاہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس نئے پن کے ساتھ غزل کو صحیح اور اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ رشید احمد صدیقی بھی یہ اعتراف کرتے ہیں۔ ''غزل گوئی کوئی کرے غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے۔''

جگر مراد آبادی کا شمار بھی ایسے غزل گو میں ہوتا ہے جس کے بغیر اردو غزل کی شان تغزل کبھی بیان نہیں کی جاسکی۔ جگر نے اپنے کلام کلاسیکی رچ رچاؤ ہمیشہ قائم رکھا۔ جگر کی شاعری میں ایک والہانہ پن ہے محبت کو انہوں نے اپنا مذہب بنایا تھا اس کی غمازی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے مطابق محبت ایک لازوال اور لافانی جذبہ ہے جس کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک وجود میں آئی۔ اس تحریک سے متاثر ہونے والے شعرا کی بھی خاصی تعداد ہے جن کی شاعری میں زندگی کی حقیقت اور سچائیاں تھیں جس نے فیض کو یہ کہنے کے لیے مجبور کیا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ترقی پسند تحریک کی وجہ سے غزل کی شہرت میں کمی آئی مگر اس کی شہرت اور مقبولیت میں ترقی پسند شاعروں کا بھی حصہ رہا۔ فیض احمد فیض، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطان پوری، اسرار الحق مجاز، جگن ناتھ آزاد، روش صدیقی، معین احسن جذبی، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، شہریار وغیرہ قابل احترام ہیں۔

اردو شاعری کی تمام صنفوں میں سب سے زیادہ ترقی کرنے والی ہر دل عزیز غزل دور بہ دور وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آگے بڑھتی جارہی ہے۔ بقول قمر رئیس صاحب ''غزل بہت سخت جان ہے''۔

☆☆☆

میر تقی میرؔ

میر تقی میرؔ ایک ایسے شاعر ہیں جس کے شاعرانہ کمال وفن کے معترف ومعتقد ان کے ہم عصر شعراء اور شعرائے متاخرین رہے ہیں۔ اور آج بھی میرؔ کی شاعری اپنی پوری تازگی اور شعریت کے ساتھ مقبول عام ہے۔کوئی تذکرہ نویس یا کوئی شاعر ایسا نہیں ملے گا جو میرؔ کے ''خدائے سخن'' ہونے سے انکار کرے۔ ناسخؔ اور غالبؔ کا عقیدہ ہے کہ ''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں'' ذوقؔ کو یہ حسرت رہی کہ

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

یا غالبؔ جب یہ کہتے ہیں۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

خود میرؔ کو بھی احساس تھا کہ

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

یہ احساس کہ ''ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے'' میرؔ کو کیوں کر پیدا ہوا اور میرؔ کی شاعری کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کا اعتراف غالبؔ ، ذوقؔ، دردؔ وغیرہ نے کیا ___ کلام میرؔ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ میرؔ ایک

حساس، دردمند اور باشعور انسان تھے۔ میرؔ کا دیوان، دردوغم کا ایک مجموعہ ہے میرؔ خود کہتے ہیں

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

آخر میرؔ کا دیوان "حکایت دردوغم" کیونکر ہوگیا؟ وہ کون سی باتیں تھیں جس نے میرؔ کو میرؔ بنایا۔ یہ جاننے کے لئے میرؔ کی شاعری کو میرؔ کے زمانے کے معاشرتی تہذیبی ماحول اور ان حالات واسباب کی روشنی میں سمجھنا ہوگا جن کے اندر میرؔ کی شخصیت کی تعمیر ہوئی۔ میرؔ کے عہد میں سارا ملک انتشار کا شکار تھا۔ پھر ان کی پوری زندگی پریشانی اور عسرت میں بسر ہوئی۔ عہدِ طفلی میں باپ کا انتقال ہوگیا، بھائیوں کا بے دردانہ سلوک نیز دوسرے حوادثِ زمانہ نے ان کو ہمیشہ بے کل اور بے چین رکھا۔ ان تمام سماجی اور معاشرتی، شخصی اور ذاتی حوادث واردات کو سامنے رکھ کر جب ہم میرؔ کی شاعری خصوصاً ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کی آواز انتہائی شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنے زمانے کے کرب واضطراب کو ظاہر کررہی ہے۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت وتاج کا

میرؔ کو دراصل ان کے ناخوشگوار حالات نے میرؔ بنایا۔ ایک انسان آرام کی زندگی بسر کرتا میرؔ جیسا سنجیدہ وخوددار، حسرت ویاس، دردوالم، ہجر وفراق اور سوز وگداز سے بھرپور تڑپتا ہوا دل کہاں سے لاتا۔

کس کس طرح سے عمر کو کاٹا ہے میرؔ نے
تب آخری زمانے میں یہ ریختہ کہا

میرؔ نے یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اصلاً وہ غزل کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ وجہ یہ کہ غزل کے لئے جس کیفیات عشق اور واردات محبت کو بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، میرؔ اُن سے ذاتی طور پر آشنا تھے۔ اس لئے جہاں کہیں انھوں نے اپنے کلام میں مسائل تصوف واخلاق کو اپنایا ہے یا آلام زندگی کو بیان کرتے ہیں عشق کے ساتھ سانحات زندگی کا بیان میرؔ بڑی دردناکی سے کرتے ہیں۔ عشق نے ان کے دل میں خستگی اور گداختگی

پیدا کردی تھی ان کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں ان کا انفرادی رنگ تغزل نمایاں نہ ہو اور میرؔ کا یہ تغزل سب کے دل میں گھر کر چکا ہے۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ابہام بھی نہیں

میرؔ کی غزلوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں بیشتر حصہ اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے فارسی غزل سے الگ ہے ان کی زبان نہایت صاف آسان ودلکش ہے اور الفاظ بہت نازک اسی لئے محبت کے نازک اورلطیف جذبات کی جو معصومیت میرؔ نے کی ہے وہ ہرصورت سے سادہ اورخوبصورت وپاکیزہ ہے۔ اخلاص سے بھرپور، تصنع اور بناوٹ سے بہت دور دل سے نکلی ہوئی بات دل کو لگتی ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اورگریباں کے چاک میں

حالیؔ مقدمہ شعروشاعری میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں:'' مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر چاک گریباں کا مضمون باندھنا ہو'' مجنوںؔ گورکھپوری کا خیال ہے کہ :''میرؔ کے تخیل کو ان کے تجربے نے بھی مدد دی ہے ان کو واقعی ایسے ''جنون'' سے پالا پڑتا تھا جو کبھی روبہ انحطاط نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ الٹے سال بہ سال بڑھ رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے گریبان کا چاک روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے''۔

میرؔ اردو کے ان ابتدائی شاعروں میں سے ہیں، جنھوں نے صرف محبت کی رنگین داستانیں، محبوب کے ہجر کی آفت، وصال کا اشتیاق، انتظار کی مصیبت اور بے وفائی کی شکایت ہی نہیں کی بلکہ اپنے فن سے کچھ نئے کام بھی لئے۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

اب تک کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جو سادگی، خلوص اور تاثیر میں میرؔ سے آنکھیں ملا سکے۔ میرؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے بقول غالبؔ ''دل گدافتہ'' کی ضرورت ہے۔ میرؔ حقیقتاً رازہائے عشق اور رازہائے زندگی پر عبور حاصل کر چکے تھے اور آلام عشق اور آلام روزگار پر فتح پا چکے تھے اس لئے جو کچھ کہتے تھے اس میں صداقت کی تاثیر ہوتی تھی۔

محبت ہے یا کوئی جن کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

اس شعر میں عاشق کے مزاج وطبیعت کا حال کس والہانہ انداز میں اور کس سپردگی اور شکستگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

عشق کی دلگدازیوں اور زندگی کی ناکامیوں نے میرؔ کو نازک مزاج اور بدمزاج بنادیا تھا۔ میرؔ کو خود اس کا احساس تھا۔

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

میرؔ کی شاعری میں غم عشق اور جنون کی کیفیت ملتی ہے حسن وعشق سے ملنے والا غم اور اس سے پیدا ہونے والا جنون ان کی شاعری کے سب سے نمایاں موضوع ہیں۔ان کی غزلوں میں حسن وعشق کی جیتی جاگتی تصویریں صاف بتاتی ہیں کہ حساس فنکار نے ساری زندگی محبت کرنے میں گزاری ہے کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ کے دل کا خمیر عشق سے ہوا تھا اور یہی ان کی شاعری کا خمیر ہے۔ کہتے ہیں۔

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

اوراسی آلام عشق نے انھیں آلام زندگی سے مقابلہ کرنا سکھایا اور اسی نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنے محسوسات و واردات کو ٹھنڈے دل سے بیان کرجائیں یہ انھیں کا حوصلہ اور انھیں کا جگر تھا کہ اپنی حرماں نصیبی کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھرآوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگرآوے

مجنوںؔ گورکھپوری نے لکھا ہے:''میرؔ کے اضطراب میں ایک سکون ہوتا ہے جو حاوی ہوتا ہے ان کے سوز وگداز میں ایک گہرائی اورسنجیدگی ہوتی ہے جوغالب ہوتی ہے۔ان کی شاعری کی مجموعی خصوصیت کوصرف ایک ہندی لفظ میں بیان کیاجاسکتاہے اور وہ لفظ''گمبھیر'' ہے ملاحظہ ہو یہ شعر۔

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میرؔ کی شاعری میں بیک وقت بہت سی خصوصیتیں موجود ہیں۔محاکات میں بھی انھوں نے کمال دکھایا۔میرؔ کی مصوری بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

احوال میرؔجی کا مطلق گیا سمجھ
کچھ زیرِلب کہا بھی تو دیر دیر رو کر

میرؔ نے غزل کی خاص زبان تشبیہات و استعارات، تلمیحات و علامات کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔میرؔ کے فن کی فضا بسیط اور ماحول حقیقت پسندانہ ہے، ان کی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کا امتزاج اسی انداز میں ملتا ہے۔

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

میرؔ میں بڑی ذکاوت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات کو ندرت اور لطافت بھی عطا کی ، یہی شعریت ہے۔ میرؔ کی شاعری میں تخیل کی کارفرمائی بھی جا بجا ملتی ہے، جیسے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

میرؔ کے تخیل نے تصور کو اکسایا ہے اور مختلف شعروں میں اس کی مدد سے بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ ان میں صرف نقاشی نہیں معنوی تصویر کاری ہے۔

ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

میرؔ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ یاس پرست تھے ان کی شاعری میں قنوطیت چھائی ہوتی ہے۔ وہ زندگی اور عشق کے حوصلے ہم سے چھین لیتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ میرؔ کے کلام میں تڑپنا اور تلملانا نہیں ہوتا۔ وہ خود داری اور سنجیدگی کے ساتھ بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ میرؔ خود ایک جری انسان تھے اور ان کا کلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہمارے اوپر خواہ خون کی موج ہی کیوں نہ گزر جائے ہم کو جرأت رندانہ نہیں بلکہ جرأت مردانہ کے ساتھ تمام صعوبتوں اور آزمائشوں کا مقابلہ کرنا ہے ایسی صورت میں میرؔ کو شکست خوردہ اور یاس

پرست سمجھنا ہماری بھول ہوگی۔ ملاحظہ ہو یہ شعر۔

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ناکامیوں سے کام لینا سب کے بس کی بات نہیں ہم اپنی زندگی میں جن باتوں سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ میرؔ انھیں باتوں کے نئے حوصلہ خیز اور نشاط انگیز امکانات ہم پر منکشف کر دیتے ہیں۔ اور ہم کو ان کے کلام سے ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ میرؔ کا زمانہ غم کا زمانہ تھا مگر انھوں نے غم کو مقدر کی طرح تسلیم کر لیا اور غم کی زندگی کی ایک نئی قوت میں تبدیل کر دیا۔ میرؔ کے غم میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت، رکھ رکھاؤ، ضبط و خودداری کا احساس اور مقابلے کی ہمت ہے ان کا غم روایت نہیں زندگی کی حکایت ہے ان کی شاعری درد انگیز ضرور ہے مگر مردم بیزار نہیں، وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے
خونابہ کشی کام کی ہے میں نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلام میرؔ کا مطالعہ ہمیں قنوطی یا یاس پرست نہیں بناتا بلکہ غم کے اندھیرے سے نکلنے کی تلقین کرتا ہے۔ میرؔ کی شاعرانہ خوبیوں کو کلیم الدین احمد نے ''میریت'' سے موسوم کیا ہے۔

غرض میرؔ کا اسلوب منفرد ہے ان کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں ان کی شخصیت کی طرح سادگی، متانت کے ساتھ بے تابی، درد و گداز، سوز و ساز، لطافت و نفاست شائستگی، نرم مزاج، حسن زندگی کا احساس، نشاط غم کا جاگا ہوا شعور اور بصیرت پائی جاتی ہے انہیں خوبیوں نے میرؔ کو غزل گویوں کے درمیان اعلیٰ وارفع بنایا ہے۔

☆☆☆

میر تقی میرؔ۔ پہلی غزل

(۱)

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں
رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں

دہلی اسکول کے عہد زرّیں دور کے نمائندہ شاعر میر تقی میرؔ کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی ملی جلی ایک ایسی تصویر اُبھری جس نے اردو غزل کو آبرو بخش دی عشق کی ناکامی اور تصوف کی پاکیزگی نے ان کے اندر اور باہر کی دنیا پر گہرے اثرات ڈالے اور اردو شاعری میں میرؔ خود میر کارواں بن گئے۔

تشریح

پہلا شعر ــــــ

شاعر کہتا ہے کہ جن کی محبت میں میں دیوانہ ہوگیا پاگل ہوگیا اور ذلیل وخوار ہوا، وہی مجھے پہچاننے سے انکار کر رہا ہے یعنی جس کی محبت اور قرب میں میں اس دیوانگی کے مقام پر پہنچا وہی ایک شخص مجھے اپنا نہیں سمجھتا مجھ سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا جس کو میرؔ نے خود یوں بھی کہا ہے۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دوسرا شعر ــــــ سدا ہم تو کھوئے .....

شاعر کہتا ہے کہ میں عمر بھر اپنے آپ میں نہ رہا میں کون ہوں کہاں ہوں یہ ایک معمہ رہا، لیکن وہ محبوب سے پوچھتا ہے کہ تم کیا اس راز سے آشنا ہو کہ میں کس ذات میں کھویا رہا اپنے ہوش میں تو تھا نہیں لیکن تم تو با ہوش تھے تمہیں بتاؤ کہ میں تا حیات کہاں رہا۔ یعنی محبوب کے تصور کے علاوہ مجھے کائنات کی ہر شئے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ لہٰذا محبوب ضرور آشنا ہوگا کہ میں صرف اس کے تصور میں غرق رہا خود میرؔ نے اسے دوسرے انداز سے اس طرح کہا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں مجھ کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

تیسرا شعر ____ یہی تا دم مرگ .....

شاعر کہتا ہے میں ہمیشہ بس اسی مرض عشق میں مبتلا رہا۔ بستر مرگ پر بھی مجھے اسی محبت کا غم ستاتا رہا محبت کے فراق کو میں بھی برداشت نہیں کر سکا بجز اس کے میرا کوئی اور نہیں تھا سو میں کیسے صبر کرتا۔

چوتھا شعر ____ شب آنکھوں سے دریا .....

غم کی انتہائی شدت کا عالم ہے شاعر کہتا ہے کہ میں تمام رات آہ و زاری کرتا رہا، آنکھیں برس برس کر دریا کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ میری ذات اس میں غرق ہو جاتی میں نیست و نابود ہو جاتا مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ منحوس گھڑی آنے سے اپنے خیال یار اور محبوب کی ذات نے نظر کرم ڈال کر مجھے کنارے لگا ہی دیا، یعنی صبر و سکون کے چند لمحے مجھے میسر ہو گئے۔

پانچواں شعر ____ لگے سر سے جوں .....

جس طرح شمع سر سے لے کر پاؤں تک جل جاتی ہے۔ یعنی زخم ہی زخم ابھر آتے ہیں۔ (جب موم بتی جل جاتی ہے تو موم کے گول دائرے جگہ جگہ دکھائی پڑتے ہیں۔ موم کے چہرے پر بعد جلنے کے نشان بن جاتے ہیں) شاعر نے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ میری ذات بھی مثل شمع کے زخموں سے چور چور ہے کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں پر زخم دکھائی نہ دیتے ہوں۔

چھٹا شعر ____ ہمیں پیش و پس .....

شمع اور پتنگا دونوں کا جلنا عین مقدر ہے۔ کوئی پہلے جل جاتا ہے، بعد میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ شاعر اسی طرح سے اپنے آپ کو پاتا ہے۔ کہتا ہے کہ جس نے مجھے جلایا۔ اس کو بھی میرے ساتھ جلنا پڑا یعنی میں اگر اداس ہوا تو وہ بھی تو اداس ہوگا میں اگر خاک ہو گیا تو اس کو بھی خاک میں ملنا ہوگا۔ میری زندگی سے وہ زندہ ہے اور مری موت سے اس کی موت۔ میں مر گیا تو محبوب کی تمام حشر سامانیاں رعنائیاں مہربانی اور رسوائی سب میرے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔

ساتواں شعر ____ ازل میں ملا کیا.....

جب دنیا بنی اس وقت اس کائنات کو نہ جانے کیا کیا خدا نے نوازا، مجھے زندگی خواہشات کا سمندر دیا۔ زندگی نے خوبصورت پیکر دیا۔ لیکن موت نے فراخ دلی سے کام نہیں کیا۔ لے دے کے یہی ایک دل تھا۔ موت نے لے لیا۔ وہ صرف ایک دل کی فراق میں تھی سو اس کو مل گیا۔ موت کو ہمیشہ دل سے بیر ہوتا ہے سو اس کو وہ بھی چھوڑتی نہیں۔

آٹھواں شعر____ رہا تو تو اکثر.....

میرؔ نے اپنے آپ کے لیے کہا ہے کہ تو تو ہمیشہ غم زدہ رہا غموں سے نباہ کرتا ہے ہوسکتا ہے تو اپنے اس عمل میں خوش رہا ہوں مگر تیرا یہ المیہ کردار کسی اور کو پسند نہیں آیا خود میرؔ نے کہا۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ ہم نے
درد غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ نے عاجزی سے یہ بات کہی ورنہ اس کے دیوان نے روئے زمین پر اپنی مقبولیت کے گہرے نقوش چھوڑے۔

☆☆☆

دوسری غزل:

مہر و وفا و لطف ایک سے واقف ایمن نہیں
اور تو سب کچھ طنز وکنایہ، رمزو اشارا جانے ہے

اردو شاعری کا محبوب خاص طور پر غزل کا محبوب ہرمکر وفریب سے آشنا ہے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔ یوں تو وہ انسانی زندگی کے ہر فعل سے آشنا ہے اس کا ہر عمل انسان کو کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے مگر افسوس کہ وہ لفظ محبت اور اس کے مترادفات سے واقف نہیں رسم الفت سے وہ ااشنا نہیں ایزا رسائی اس کا شیوہ ہے محبت سے وہ بیگانہ ہے۔

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ جی اٹھتا ہے دیکھے اسے
یاد کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

عاشق تو ہمشہ مردہ نظر آتا ہے بس اس وقت اس کے چہرے پر رونق نظر آتی ہے جب محبوب کی دید ہو جاتی جب اس کی یاد آتی ہے تو دل کے گوشے گوشے منور ہو جاتے ہیں ورنہ وہ ہر لحہ کوفت اور اذیت میں مبتلا رہتا ہے مثل مردہ کے وہ زندہ، رہتا ہے جس کو غالب نے کچھ اس انداز سے کہا۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کیا کیا فتنے سر پرا کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل، بیتاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

عاشق کے پاس سوائے ٹوٹے اور کمزور دل کے اور کچھ نہیں جس میں نا کام حسرتیں اور ارزوئیں دم ٹوڑتی نظر آتی ہیں لیکن یہ محبوب جس کی وجہ سے اس دل کی حالت انتہائی ابستر ہے۔ وہ اس کی دلجوی کے برائے الٹے اس کے اور پر ستم رانی کے پہاڑ توڑ رہا ہے اس کو تکلیف دیتا ہے آنے والا ہر دن قیامت سے کم نہیں کیونکہ نہ جانے محبوب آج ظلم وستم کا کون سا نیا حربہ اس پر استعمال کر کے ناتواں اور مصیبت زدہ عاشق کے دل سے کوئی

پوچھے۔

تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخئی کش
دم دار تیغ آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

میرؔ تو بھی کیسا نادان عاشق ہے خود اپنا دشمن کیوں بن گیا ہے اس کی تلوار جیسی نگاہوں سے خود کو زخمی کر بیٹھا (جب آنکھوں میں دم دار کاجل لگا ہوتو وہ تلوار کے مانند نظر آتی ہیں اور انتہائی خوبصورتی کی علامت مانی جاتی ہیں لہذا ہمیشہ عاشق ان کا تمنائی ہوتا ہے) شاعر نے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے جان بوجھ کر اس سے زخم کھانے میں لطف محسوس کر رہا ہے۔

☆☆☆

خواجہ میر درؔد

خواجہ میر درؔد جن کا شمار اردو کے اہم صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔ 1921 میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی ایک مشہور صوفی شاعر تھے ان کا دیوان نالۂ عندلیب کے نام سے شائع ہوا ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی بچپن سے ہی شعر شاعری کا شوق تھا۔ خاندان میں پیری مریدی کا چلن تھا۔ درؔد نے شروع سے ہی تصوف کے مسلک کو اپنایا مذہب اور تصوف کے بارے میں فارسی زبان میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ احکام الصلوٰۃ اور واردات درؔد کے نام سے رسالے بھی شائع ہوئے۔ فارسی اور اردو میں دیوان شائع ہوا۔ 1785 میں انتقال ہوا۔

اردو میں صوفیانہ شاعری کا رواج فارسی شاعری کے زیر اثر وجود میں آیا۔ تصوف کا سب سے زیادہ ذخیرہ آج بھی فارسی شاعری میں موجود ہے۔ ظاہر ہے اردو میں جب شعر و شاعری کا آغاز ہوا تو فارسی ادب پیش نظر رہا ہوگا۔ فارسی شاعری کی تمام خوبیاں اردو شاعری میں منتقل ہوگئیں تصوف کے مضامین بھی وہیں سے آئے کچھ لوگوں نے روایتاً اسے اپنایا لیکن کچھ لوگوں نے تصوف کی نمائندگی زندگی کے لحاظ سے کی۔

خواجہ میر درؔد کی شاعری صوفیانہ شاعری میں ایک اعلیٰ مقام کی حامل ہے کیونکہ درؔد نے اردو غزل کو باقاعدہ پیش کیا۔ عشق اور تصوف کی نیرنگیوں نے درد کو اپنے دور میں نمایاں مقبولیت بخشی میر درد کے یہاں تصوف قول سے زیادہ عمل میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے لکھا ہے۔

''دردؔ کی شاعری کا لب و لہجہ صوفیانہ ہے ان کے کہنے اور سوچنے کا ڈھنگ دوسرے صوفی شعراء سے ممتاز ہے ان کے لیے تصوف ایک نظریہ نہیں ایک تجربہ زندگی ہے محض عقیدہ نہیں عمل بھی ہے''

ڈاکٹر عبداللہ نے دردؔ کا کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1- خالص تصوف کے رنگ میں مثلاً

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھائے
پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دئے

2- خاص مجازی رنگ جیسے

ہم کہتے نہ تھے درد میاں چھوڑ یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

3- ایسے اشعار جن کا موضوع مقرر نہیں کیا جاسکتا تصوف میں سمجھئے یا مجازی میں مثلاً

میر اجی ہے جب تک تیری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے

دردؔ مزاجاً قناعت پسند شاعر تھے۔ مولف خمخانہ جاوید کا بیان ہے۔

''یہ صبر و قناعت ہی کا کرشمہ تھا کہ سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ و انشاءؔ ایسے مشاہیر سلطنت کی تباہی اور رات دن کی غارتگری سے تنگ آکر تلاش روزگار میں دہلی کو خیرباد کہہ کے بلاد شرقیہ کو روانہ ہو چکے تھے مگر دردؔ کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی''

ایسے حالات میں بھی دردؔ نے ایک حوصلے اور ہمت کا ثبوت دیا حالات کا مقابلہ کرتے رہے ان اوصاف کی جھلک ان کے کلام میں نمایاں ہے۔

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نہ تاج کی ہوس نہ ارادہ غرور کا

دہلی کے خراب حالات اور اس وقت جو ماحول تھا اس کا ذکر دردؔ نے کچھ اس طرح سے کیا۔

اہل زمانہ آگے بھی تھے اور زمانہ تھا
پر اب جو کچھ ہے یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو ہم میں بھی دل تھا دماغ تھا
گزرا ہوں جس خرابے میں کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

قاضی عبدالستار صاحب دردؔ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''دردؔ اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام اپنی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اپنی متوکل زندگی کی طرح ان کا کلام بھی نہ صرف ہموار پاکیزہ اور سنجیدہ ہے بلکہ ہر طرح کی لغویات سے بھی پاک ہے''۔

میر دردؔ، سوداؔ، میر تقی میرؔ کے ہم عمر شاعر ہیں اس وقت شاعری میں مجازی محبت کے نغمے گونج رہے تھے۔ لہذا دردؔ بھی اپنے کو ان اثرات سے بچا نہ سکے انھوں نے بھی اپنی غزلوں میں محبت کا جو رنگ پیش کیا ہے اس میں بڑی رعنائی اور رنگینی ہے۔ مجازی اور حقیقی جزبوں سے لبریز ہے اس خوبصورت میل سے کیفیت ہی بدل گئی جسے ڈاکٹر عبداللہ نے پیوند کاری کا نام دیا ہے۔

''مجاز و حقیقت کا یہ پیوند دراصل دردؔ کے صوفیانہ ذہن کا نتیجہ ہے ان کی شاعرانہ طبیعت اور صوفیانہ فطرت ان کی غزل میں اس طرح ہم آہنگ ہوگئی ہے کہ اس سے ایک نہایت ہی خوشگوار امتزاج پیدا ہوگیا ہے اس کی وجہ سے ان کی غزل اپنی پرشوق عاشقانہ ترنگ کے باوجود اپنے عارفانہ مرکز تحریک سے دور نہیں ہوئی مجاز و حقیقت کا یہ امتیاز و ازدواج دراصل دردؔ غزل کے امتیازات خاص میں سے ہے''۔

مندرجہ ذیل اشعار میں کچھ ایسی ہی کیفیات کا ذکر ہے۔

1: تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا

تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

2: نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

3: ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

4: دل میرا باغ دل کشا ہے مجھے
دیدہ جام جہاں نما ہے مجھے

دردؔ کی شاعری کا وہ خوبصورت روپ جہاں دردؔ نے غزل کی تمام روایات کو اپنایا ہے وہ ان کی شاعری کا خوبصورت پہلو ہے شاید اسی وجہ سے انھیں میرتقی میرؔ کا ہم پلہ شاعر بھی کہا گیا۔ سید امداد امام اثر نے لکھا ہے۔
''سوزو گداز میں ان کا جواب میرؔ تھے یا وہ آپ اپنا جواب تھے۔''

دردؔ کی شاعری ایک دوسرا پہلو بھی جہاں انھوں نے حسن کے وجود کو تسلیم کیا ہے حسن کی تمام رنگینیوں سے بھی آشنا ہیں۔ دنیا کی دلکشی زندگی کا نشاطیہ رنگ معاملہ بندی چھیڑ چھاڑ شوخی سے انکھیں بند نہیں کیں بلکہ اپنی شاعری میں ان خوبصورت تصویروں کو ایک وقار اور توازن کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے
کوئی اس بات سے آگاہ نہ ہو

میں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹھ اس کا بھی دردؔ مل گیا تھا

تو چونکتا عبث ہے کی بات کے لیے
میں آگیا ہوں صرف ملاقات کے لیے

ہم نشیں! پوچھو نہ اس شوخ کی خوبی مجھ سے
کیا کہوں تجھ سے عرض جی کو مرے بھاتا ہے

عشق محبت کے ہزار رنگ ہیں ایک وہ جذبہ جس میں انسان ڈوب کر یہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی بڑی حسین وخوبصورت ہے وہیں دوسرا پہلو درد وغم سے بھرا ہوا ہے جہاں محبوب کے ظلم وستم ہیں وہاں بھی دردؔ نے صرف نالہ سے کام نہیں لیا بلکہ ان کے بیچ رہ کر نباہ کرنے کی عادت ڈال لی جس کی وجہ سے درد میں بھی انھیں لذت محسوس ہوتی ہے۔

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرح تونے آنکھ بھر دیکھا

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

اس کی باتیں مجھ سے کیا پوچھو ہو تم
مدتیں گزریں کہ دیکھا بھی نہیں

دردؔ کی شاعری میں محبت ہر جگہ جلوہ افروز ہے جو مجازی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ ان کی شاعری میں جو گداز ہے وہ اس کی دین ہے دردؔ نے اپنے زمانے حالات چاہے وہ سیاسی ہوں سماجی ہو سب کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

عالم میں جتنے پاک گہر تھے سو ایک ایک
اولے سے روزگار نے یونہی گھلا دیئے

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہو ستم دیدہ
گر دل ہوں تو ازردہ خاطر ہوں رنجیدہ

خواجہ میر دردؔ کی زبان سادہ سلیس شیریں اور دلکش ہے محاوروں کی جاشنی تشبیہات و استعارات کا خوبصورت استعمال ہوا ہے نفاست اور سادگی ہے بڑی سے بڑی بات کو بھی بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اختصاد ہے۔ غزلیں چھوٹی بحروں میں ضرور ہیں مگر کامیاب ہیں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

''خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں لکھتے ہے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔''

اشعار دیکھئے۔

اب دل کا سنبھالنا ہے مشکل
اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

جوش جنوں کے ساتھ سے فصل بہار میں
گل سے بھی ہوسکی نہ گریباں کی احتیاط

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیرے وہ جس کے مجھے رو برو کرے

مختصراً یہ کہ میر دردؔ نے اپنی فکر اور فلسفے کی مدد سے ایک ایسی روایت کی بنیاد ڈالی جو اس عہد کے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتی بعد کے شعراء نے بھی ان کی تقلید لی یہی چیزیں ان کی عظمت کی دلیل ہیں۔

☆☆☆

پہلی غزل کی تشریح:۔

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

اس شعر میں شاعر نے کائنات کی بے ثباتی کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے انسانی زندگی امید سے عبارت ہے مگر ساری امیدیں جب پوری نہیں ہوتیں تو انسانی زندگی حسرتوں کا مزار بن جاتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ دل ناکام حسرتوں کا جنازہ بن گیا اتنے رنج وغم جمع ہوگئے ہیں کہ اس دنیا سے جی گھبرا گیا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم جز وفا
پردہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

میری انکھیں تجھ میں وفا تلاش کرتی رہیں مگر انھیں تو وفا دیکھنا نصیب نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود وہ کیا چیز تجھ میں نظر آئی کہ تو مجھے پیارا لگنے لگا اور میں تجھ پر مرمٹا اور تیری وفا کا دم بھرنے لگا۔

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں میری
جی میں یہ کس کا تصور آگیا

جب تمہارا تصور میری آنکھوں میں آجاتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ کاش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ آنکھیں بند ہو جائیں میں تمہارا تصور جیتا رہوں اور اس تصور میں ہی دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر میری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

میں نے اپنے دل کا راز کسی ظاہر ہونے نہیں دیا۔ مگر یہ کیا میرے حال وال میرے عشق کی کو خبر لگ گئی خوشبو اور عشق دونوں احتیاط کے باوجود عیاں ہو جاتی ہے میری نگاہوں نے بھی میرے عشق کو لوگوں پر منکشف کر دیا پروین شاکر کا یہ شعر کہ

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پزیرائی کی

پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد
غم تیرا کتنے کلیجے کھا گیا

جب تمہاری یاد آتی ہے مت پوچھو دل پہ کیا کیا قیامت گزر جاتی ہے یہ یاد بڑی ظالم چیز ہے جتنا انھیں نظرانداز کرو اتنا ہی یہ سامنے آتی ہیں کسی کو بھولنے کے لیے بھی اسے یاد کرنا پہلی شرط ہے۔تم سے ملاقات ہونے کی کوئی امید نہیں اور پھر یہ ظالم یاد صرف کرب اور اذیت کے سوا کچھ نہیں دیتی غم زدہ یادیں اور بھی کلیجہ کھائی ہیں۔

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

شاعر کہتا ہے کہ میری بے ربط اور بے سمت گفتگو سے چاہے کچھ حاصل ہوا ہو لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کی ذات سے کچھ جھجک ضرور نکل گئی یعنی وہ میری باتوں کو سننے لگا اور کچھ لگاؤ تو محسوس کرنے لگا یعنی کسی سے کچھ نہ کچھ روز کہتے رہیے تو کچھ تو اثر ضرور ہوتا ہے۔

☆☆☆

دوسری غزل کی تشریح:۔

ہستی ہے جب تک ہم ہیں اسی اضطراب میں
جوں موج آپ سے ہیں عجب پیچ و تاب میں

جب تک زندگی ہے تو زندگی کے جھمیلے تو ساتھ ساتھ رہیں گے جب خدا نے دل بنایا تو اسمیں غم دوراں اور غم جاناں دونوں کو جگہ بھی دے دی۔ زندگی اس کائنات میں اسی طرح الجھ گئی ہے جیسے بھنور کے بیچ موجیں ہوں موجیں ساحل تک جانے کے لیے سر پٹکتی ہیں مگر انھیں کنارا نہیں ملتا اور دریا کی طغیانیوں سے نجات حاصل نہیں ہوتی۔

نے خانۂ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رہتا ہے کون اس دل خانہ خراب میں

میرا دل نہ تو خدا کا گھر ہے اور نہ ہی یہ بتکدہ ہے پھر بھلا اس میں کون آبسا ہے یعنی میں نہ تو فرشتہ ہوں اور نہ شیطان میں تو ایک معمولی انسان ہوں اور میرے جیسے معمولی انسان کے دل میں کسی بستی کا بسیرا ہے یعنی کسی کی محبت میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔

آئینہ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موج زن تمام یہ دریا حباب میں

انسان کی زندگی ملک عدم میں جا کر پھر فنا تو ہو جاتی ہے مگر غور کیا جائے تو مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا پڑتا ہے اور ایک ابدی زندگی ملتی ہے بطور سزا اور جزا یہ زندگی پھر ہمارا مقدر ہوتی ہے۔ بلکل اسی طرح دریا کی سطح پر بلبلے ابھرتے ہیں اور پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اسی طرح عدم میں زندگی ملتی ہے بظاہر فنا ہونے کے بعد یعنی زندگی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

صوفی مسلک کا واضح تصور ہے کہ مرنے کے بعد بھی انسان مرا نہیں بلکہ زندہ رہا موت تو آئینہ محض ہے اس میں دراصل زندگی کا چہرہ نظر آتا ہے دردؔ کی صوفیانہ شاعری کا خوبصورت اظہار یہاں نظر آتا ہے۔

غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

یہاں پر بھی کائنات کی بے ثباتی کو شاعر نے صوفیانہ رنگ دے ڈالا ہے اے غافل انسان دنیا تو چند لمحہ کے لیے ہے اور اتنی فرصت کو ہی بیش بہا قیمت سمجھو کیونکہ انسان کی زندگی چند لمحوں کی دولت ہے پھر تو زندگی ختم اور خوالوں میں ہی زندگی کو دیکھا جاسکتا ہے یعنی اس چندروزہ زندگی میں اچھے اچھے کام کرلو پھر نہ یہ زندگی اور نہ زندگی کے حوصلے سب کچھ فنا ہو جائے گا خواب کی طرح نظر آنے لگے گا۔

پیری نے ملک تن کو اجاڑا گرنہ یاں
تھا بندوبست اور ہی عہد شباب میں

آج ہم بڑھاپے کی باعث نحیف و لاغر دکھائی پڑ رہے ہیں ورنہ ہمارا خوبصورت جسم کسی زمانے میں بہاروں کو دستک دیتا تھا یعنی زندگی ہمیشہ عروج و زوال کی طرف راغب ہے لہذا عہد شباب پر غرور بے معنی ہے۔ سردار جعفری نے کیا خوب کہا ہے۔

آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ کاغذ کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گزشتہ کی کتاب

یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے
یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایاب شباب

میں اور دردؔ مجھ سے خریدارئی بتاں
ہے ایک دل حساب میں سوکس بساط میں

شاعر کہتا ہے کہ میں محبت کا خریدار کیسے بنوں۔ محبت کی شراب تو میری بساط کے باہر ہے کیونکہ میں صرف ایک دل رکھتا ہوں اور اس میں محبوب کے ساتھ اس کے ناز و غمزے کیسے سما سکتے ہیں لہذا اگر اس بت سے دل لگایا

تو پھر ہزار غم بھی اس کے ساتھ میرے دل میں آویزاں ہو جائیں گے۔

☆☆☆

تیسری غزل کی تشریح:۔

تمہیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

میر دردؔ کی انتہائی مشہور غزل ہے جس میں شاعر نے تصوف کے کئی راز ہم پر عیاں کر دئے ہیں بے ثباتی کائنات غم دوراں کی شکایت سے اس غزل کا لب و لہجہ آج بھی لوگوں کو فوری طور پر متاثر کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔

اس دنیا میں آنے کے بعد اپنے نامۂ اعمال میں چند رسوائیوں اور ذلتوں کے انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا وہ جدھر سے آتا ہے اسی جانب پھر رخ کرتا ہے انسان کو آج کے دور میں سوائے رسوائیوں اور تلخیوں کے اور کچھ نہیں ملتا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس تیز رفتار زندگی کو زندگی کا نام دوں یا پھر کوئی طوفان جو سارے نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے زندگی کے اتنے ہی اتار چڑھاؤ اور امتحانات سے دو چار ہونا پڑے گا اگر ہم یہ جانتے تو زندگی کے خریدار نہ بنتے۔ ہم تو اس زندگی سے عاجز ہیں گویا زندہ نہیں بلکہ قدم قدم پہ موت کا سامنا ہے۔

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم ادھر اودھر چلے

اے صبا ہم کو ان پھولوں سے کیا نسبت کیا کام کیونکہ ابھی یہ کھل اٹھے ہیں اور ابھی دوسرے لمحہ ہی یہ مرجھا جائیں گے۔

دوستو دیکھا تماشایاں کہ بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

اے بزم یار اے ہم نفسو ہم نے اس دنیا کا مزہ لے لیا زندگی کی بزم ارائیوں کو ہم نے اجڑتے دیکھا اور

پھر بکھرتے دیکھا میں تلخئی ایام سے گھبرا گیا ہوں میں جہاں سے آیا تھا میں اسی جانب پھر جانا چاہتا ہوں تم لوگ چاہو تو رہ سکتے ہو لیکن میرا دل اس میکدے سے بھر گیا ہے۔

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ہم اس کائنات میں مثل شمع جلوہ افروز ہوئے اور پھر غمناک آنکھوں سے رخصت ہوئے یعنی جب کائنات میں قدم اولیں رکھا تو جشن نومولود منایا گیا لیکن جب رخصت ہوا تو ساری بزم کو روتا چھوڑ گیا اور جب تک زندہ رہا خود بھی روتا رہا۔ (جیسے موم جل جل کر آنسوؤں کی شکل میں موم بتی پر اکٹھا ہو جاتی ہے) شاعر نے اسی کی شکل میں اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔

ہم جہاں سے آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

بچہ اس کائنات میں تنہا آتا ہے لیکن پس مرگ ایک خاندان چھوڑ جاتا ہے اور پھر تنہا اس دنیا سے رخصت ہوا جاتا ہے لیکن اپنے ساتھ اپنی زندگی کی کائنات ضرور لیے جاتا ہے۔

جوں سرائے ہستی بے بودیاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساری کائنات مثل ایک سرائے کے ہے ہر شخص کچھ دنوں اور کچھ راتوں کے یہاں ٹھہرتا ہے پھر چلا جاتا ہے لہذا ہم ہی کسی نہ کسی روز جب اپنی مدت ختم کر لیں گے اس دنیا سے گذر جائیں گے۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اے ساقی لگتا ہے کہ میکدہ کا نظام اب ختم پر ہے لیکن یہ دستور ہے کہ میکدہ جب تک چلے ساغر کے دور بھی چلتے ہیں کیونکہ شراب اور جام و مینا سے ہی تو میکدہ ہے اور اس کی رونق یہ پینے والے ہیں مجھے معلوم ہے کہ

میکدہ یعنی یہ دنیا یہ زندگی ختم ہونے والی ہے مگر جب تک آخری سانسیں ہیں زندگی سے اس کی رعنائیوں کو نہیں چھیننا چاہئے ہم کو مایوس نہیں ہونا چاہئے ہر قدم پر زندگی کا پر امید نظروں سے استقبال کرنا چاہئے۔

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

شاعر کہتا ہے کہ اس راز سے پردہ اٹھاؤ کہ لوگ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں جبکہ سب کو معلوم ہے کہ ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور خدا کی جانب ہی ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔

☆☆☆

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اردو شاعری کو نئی جہت سے روشناس کرانے والے اور نئی سمت دینے والے عظیم شاعر غالبؔ 1797 میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ غالب کا پورا نام اسداللہ خاں تھا شروع میں مرزا نوشہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ مغل دربار کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر والملک اور نظام جنگ کے خطابات بھی حاصل تھے۔ صرف پانچ سال کے تھے کہ والد عبداللہ بیگ کا انتقال ہو گیا۔ پھر چچا نصراللہ بیگ کی سرپرستی میں آگئے مگر ابھی ان کی عمر صرف نو سال تھی کہ چچا کا سایہ بھر سر سے اٹھ گیا۔ چچا نصراللہ بیگ خاں سندھیاں کی جانب سے آگرہ کے قلعہ دار تھے۔ اس وقت آگرہ کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم ''شہر آشوب'' میں اس کا ذکر لیا ہے۔

توڑے کوئی قلعہ کو کوئی لوٹے شہر کو
اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ

چونکے غالب کو فارسی زبان سے گہرا لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ایران کا ایک پارسی نژاد مسلمان

عبدالصمد جو اگرے آیا تھا اس کے زیر صحبت غالب نے فارسی زبان کی تعلیم لی۔ بعد میں غالب دہلی آ گئے یہاں نواب الہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی ہوگئی۔ چچا کے انتقال کے بعد ان کے ترکہ میں 700 روپیئے مقرر کر دئے تھے مگر غدر کے واقعے نے انھیں پھر مالی پریشانیوں سے دوچار کر دیا۔ تنخواہ بھی بند ہوگئی پینشن بھی جاتی رہی۔ بعد میں عالی رام پور نے سات سو روپیئے مہینہ تنخواہ مقرر کر دی۔ مگر غالب رام پور میں زیادہ وقت نہیں رہے۔ کلکتہ کا سفر کیا وہاں سے ٹوٹتے وقت لکھنؤ میں قیام کیا۔ نواب واجد علی شاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا اس کے عوض میں انھیں پانچ سو روپیئے ماہانہ وطیفہ ملتا رہا اور جب تک اودھ کی حکومت قائم رہی یہ سلسلہ برقرار رہا۔

غالب نہایت خوش مزاج اور ذہین انسان تھے ان کی کوئی بھی تحریر و تقریر شوخی و طرافت سے خالی نہ تھی۔ خودداری اور فیاضی ان کی طبیعت میں شامل تھی ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ملنا جلنا تھا۔ ظ انصاری نے لکھا ہے۔

''غالب کے کلام میں شگفتگی کا لہجہ زندہ دلی کی لے شوخی اور مسکراتا ہوا طنز محض ایک نقاب نہیں بلکہ زندگی کے برتاؤ اور شخصیت کے سبھاؤ کے حیثیت سے نشاط کی کیفیت میں گھل مل گئے ہیں آنسوؤں کو طنزیہ تبسم بنانے میں غالبؔ کی فنکاری کا راز کھلتا ہے''۔

غالب نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی مگر ان کی شہرت اردو شاعری کے سبب ہوئی 1869 میں اس عظیم شاعر کا انتقال ہوگیا۔ مولانا حالی نے تاریخ کہی ''آہ غالبؔ بمرد''

شعر و ادب فنکار کے ذاتی مشاہدات اور احساسات سے وجود میں آتے ہیں۔ بالواسطہ طور پر ایک سماجی عمل بھی ہے کیونکہ شاعر خلاء میں زندگی نہیں گزارتا نہ وہ کوئی تارک الدنیا ہوتا ہے اور نہ سنیاسی بلکہ وہ عام انسانوں کی طرح اس دنیا کا باشندہ ہے دنیا کے نوحہ غم اور شادی میں وہ بھی عام انسانوں کی طرح شامل رہتا ہے اس کی شاعری اس کے محسوسات کا عکس اور ان پر اس کے ردعمل کا اظہار ہوتی ہے.....اس کو اس سماج میں اس دور رجحانات کا پسند ناپسند کا بھی کس حد تک خیال رکھنا پڑا ہے جو اس کا مخاطب ہوتا ہے یہ حقیقت ہے کہ شاعر کے خیالات و تصورات اس کے موضوعات الفاظ و محاورات اور پیرایہ بیان سب کچھ اس کے زمانے اور ماحول کے

پروردہ اور اس سے ماخود ہوتے ہیں۔

غالب نے جب شاعری شروع کی تو ماضی کی شعری روایات ان کے سامنے تھیں فارسی شاعر بیدل کی شاعری سے متاثر تھے اردو شاعروں میں میر مصحفی آتش نے اثرات بھی قبول کیئے۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی نے لکھا ہے۔

''بیدل کی مشکل پسندی اور گہرای، عرفی کی بلند خیالی اور رنگینی نظیری کی پرکاری، ظہوری کی تہداری کے بے شمار رنگوں نے مل کر غالب کے فن کو ایک اچھی خاصی قوس قزح بنا دیا''۔

اس زمانے میں جبکہ لوگ نظیر اکبر آبادی کی سیدھی سادی شاعری سے متاثر تھے ان کے لیے غالب کا یہ لب ولہجہ بالکل نیا اور مشکل بھی تھا، فارسیت کا غلبہ تھا۔ ان کی اس دور کی شاعری کے متعلق کہا گیا۔

کلام میر سمجھے یا بیان مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

لوگوں کے اعتراضات نے غالب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کا مل

اسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنگویم مشکل

غالب اردو زبان کے ایسے شاعر ہیں جس کی عظمت دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی ان کی شاعری ہر خاص و عام کے لیے تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے

ڈاکٹر فخر الاسلام صاحب لکھتے ہیں۔

''غالب کی شاعری ہر عظیم شاعری کی طرح ایک رنگی صفات کی حامل نہ ہو کر بڑی پہلو دار اور تہدار ہے اس میں بیک وقت دل و دماغ کو آسودہ کرنے کی ملاحیت ہے ماضی حال اور مستقبل ہر زمانے کی دھڑکنیں اس میں

سنائی دیتی ہے۔ اس میں پرانے اور نئے پن کا امتزاج ہے۔ غالب نے پرانے ذخیرے کا بہترین رس جذب کر کے اسپر نئے ذہن فکر اور لب و لہجہ کا اضافہ کیا اردو ادبیات کی بہترین لفظی اور معنوی روایات اس میں سمٹ آئی ہیں فکری عنصر کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس میں آل احمد سرور بقول ''ماضی کا رچا ہوا شعور اور حال کے پیچ وخم کا احساس اور آنے والے دور کی کرنیں بھی ہیں'' غالبؔ کی اس ہمہ جہتی اور پہلوداری کی طرف ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری نے ان لفظوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''غالب کی شاعری پہلودار شاعری ہے ان کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ہیں جن کی تفسیر شکسپیئر کی عظیم ڈرامائی شاعری کی طرح ہم مختلف سطحوں پر کر سکتے ہیں غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کی فلسفیانہ، سیاسی اور شخصی تفسیر ہم بیک وقت کر سکتے ہیں اور یہاں پہلو دار ہونے کا مطلب یہی ہے''۔

اردو شاعری میں عشقیہ مضامین کا ذکر ضرور ہوتا ہے غالب کی شاعری میں بھی عشق ومحبت کا جذبہ پورے احترام کے ساتھ موجود ہے غالب نے اس جذبے کو الگ الگ انداز سے دیکھا اور اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیا۔ غالب کی عشقیہ شاعری کے بارے میں عبارت بریلوی نے لکھا ہے۔

''اردو ادب میں غالب کی عشقیہ شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں عشق انسانی کا تصور ملتا ہے عشق کے سلسلہ میں پیش کیے ہوئے تمام خیالات تمام واردات و دکیفیات اور تمام جذبات و احساسات انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم اہنگ ہیں اور انھیں خصوصیات نے ان کی شاعری میں رس بھرا ہے رنگینی و رعنائی پیدا کی ہے''۔

عام طور سے دردوغم عشقیہ شاعری کا حصہ ہوتے ہیں مگر غالب ایسے حالات میں بھی ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہیں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ممتاز حسین نے غالب کو نشاط کا شاعر کہا ہے۔

زندگی اپنی کچھ اس طرح سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سفینہ جب کنارے پہ الگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم جو رنا خدا کرتے

غم اگرچہ جاں گسل ہے پر بچے کہ کہاں کا دل ہے
غم عشق گونہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کی میرے قتل کے بعد اس جفانے توبہ
ہائے اس زور پشیماں کا پشیماں ہونا

حسن وعشق کے مختلف پہلوان کی شاعری میں کچھ اس طرح نظر آتے ہیں۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی کہ جگر کے پار ہوتا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدیار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

تیرے سروقامت سے اک قدم آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوتی جاتی ہیں یا رب دل کے پار

جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غالب نے اردو شاعری کو فرسودہ روایات سے الگ کر کے زندگی سے قریب کر دیا۔ آل احمد سرور نے لکھا دہ ہماری شاعری جو غالب سے پہلے صرف دل والوں کی دنیا تھی غالب نے اسے ذہن دیا انھوں نے غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے موضوعات داخل کیے اور اس موضوعات کو بہت وسیع کر دیا'' ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

''اسے مریض عشق کے چکر سے نکال کر مہذب انسانوں کے دل کی دھڑکن بنا دیا''

مجنوں گورکھپوری نے بھی غالبؔ کی ان خوبیوں کو سراہا ہے لکھتے ہیں۔ ''غالب نے اردو غزل کو مجہول داخلیت اور سطحی خارجیت دونوں کے تنگ دائروں سے نکال کر فطرت انسانی سے قریب کر دیا اور اسے معنویت سے روشناس کر اور مروجہ الفاظ میں نئے ابلاغی امکانات تلاش کیے''۔

مندرجہ ذیل اشعار میں خوبیاں صاف نظر آتی ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا دوا ہو جانا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

غالب کی تصوفانہ شاعری پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی یہ چیزیں صاف نظر آتی ہیں فخر الاسلام صاحب نے لکھا ہے۔

''وہ تصوف کے مسائل میں سے انسانی روح کا درجہ انسانی اخوت انسانی عظمت خودداری اور سرکشی و سر بلندی وغیرہ کو اپنا موضوع بناتے ہیں''۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نہ نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کی شاعری میں فلسفہ بھی ہے۔

لطافت سے کثافت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اردو غزل میں فلسفیانہ خیالات کو پیش کرنے کا سہرا بھی غالب کے سر ہے غالب کی ایک اور خوبی جسے ہم جدت طرازی کا نام دے سکتے ہیں انھوں نے کہیں اپنی لے بدلی جام بدلا رنگ بدلا انداز بدلا کہیں تشبیہ و استعارے میں حدت پیدا کی کہیں شوخی اور ظرافت کے میل سے اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا یہ مثالیں ان چند اشعار میں نظر آتی ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

چھوڑا مہ نجشب کی طرح دست فضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ تھا

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا اساں ہونا
آدمی کو بھی میر نہیں انساں ہونا

غالب کے یہاں فکری عناصر بھی ہیں جو دل و دماغ دونوں کے لیے آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں بڑے سے بڑے موضوع اور چھوٹے سے چھوٹے موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر بہت ہی دلکش بنا دیتے ہیں غالب کی عظمت کا راز یہی ہے کہ ان کا اظہار و ابلاغ اپنے موضوع اور مواد کے ساتھ پوری طرح ہم اہنگ ہے ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار میں بھی نظر آتا ہے۔

آل احمد سروز نے لکھا ہے۔

''غالب کی شاعری ہماری نظر میں اس لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں فنکار کی اپنے فن سے پوری وفا ملتی ہے فن کی تازہ کاری اور لالہ کاری کا جلوہ صد رنگ ملتا ہے جو استعارے اور علامت کے ذریعے سے ذہن کو نئے نئے افق عطا کرتا ہے''۔

غالب نے اپنی بات کہنے کے لیے نئے نئے وسیلے تلاش کیے جس کی وجہ سے فن کو مزید ترقی ملی فارسی اور اردو کے امتزاج سے زبان میں ایک نیا انداز ایک نئی شال پیدا کی نئی نئی ترکیبیں ان کی تراش وخراش ردیف قافیے کا خوبصورت استعمال نغمگی اور موسیقیت نئی زمین نئی بحریں آپس میں سب چیزوں کے تال میل نے انھیں ایک عظیم شاعر بنا دیا۔

دل گزر گاہ خیال مے و ساغر ہی سہی

گر نفس جادہ سر منزل تقوی نہ ہوا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں ارزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگین کا گلہ کیا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک ہائے رنگین کا گلہ کیا

انسان دوستی کا جذبہ بھی ہر جگہ کارفرماں نظر آیا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس ہے یا رب
اک آبلہ پاوادئی پرخار میں آئے

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سو وہ بھی خموش ہے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل
جو بھی نکلا تیری محفل سے پریشان نکلا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

نئی نئی علامتوں کا بھی ذکر ہے

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
قفس میں مجھ کو روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
کہتا ہے کون نالہ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہوگئے

بیک وقت غالبؔ کی شاعری میں ان گنت خوبیاں موجود ہیں جو ان کی عظمت کی امین بھی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ''مقدس وید'' اور ''دیوان غالبؔ'' غالب اور گوئٹے کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے جدید خیالات حقیقت اور مجاز قدرت اور حیات کی کثرت سے ان کے دماغوں میں وحدت منتقل ہو کر وجود پاتی ہے دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں تہذیب وتمدن تعلیم وتربیت اور فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو''۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی غالب کو ہندوستان کی تہذیبی پیداوار مانتے ہیں۔

ان کی تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کا عکس ان کے ہی اپنے شعر میں نظر آتا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

☆☆☆

پہلی غزل کی تشریح:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

شاعر حیرت اور استعجاب میں کہ رہا ہے کہ خاک کے پردے میں مت پوچھ کیا کیا حسین وجمیل شہ چھپی ہوئی ہے یہ تو محض چند لالہ وگل ہیں جو ہمارے سامنے ہیں اور اپنی خوبصورتی پر اتراتے پھر رہے ہیں شاعر اس نقطے سے فائدہ اٹھا رہا ہے کہ انسان جب مر کر اس مٹی میں دفن ہو کر پھر خاک بن جاتا ہے تو پھر مختلف پھولوں کی شکل میں اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ کرتا ہے خدا نے پردہ غیب میں کیا کیا جمال چھپا رکھا ہے جو سطح زمین پر مثل لالہ وگل کے بکھر جاتے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

ہم تو اپنے گزرے دنوں کی وہ جواں رونقیں وہ بزم آرائیاں آج بھی یاد آتی ہیں لیکن آشوب زمانے نے ہمارے ہوش وحواس پہ وہ سنگ زنی کی سب یاد پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں ہم کبھی خود بھی بزم تھے لیکن آج صرف تنہائیوں کا ایک مرقع ہیں اور جس میں سجی ہوئی کچھ یادوں کی تصویریں ہیں یعنی انسان کبھی ایک سا وقت نہیں گزار پاتا۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعین دو فروزاں ہوگئیں

میری آنکھوں میں یہ جو دو خوں کی ندیاں رواں ہیں انھیں مت روکوں انہیں بہنے دو کیونکہ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری پزیرائی اور تمہارے استقبال میں یہ دو شمع روشن کر رکھی ہے یعنی تمہاری یاد میں یہ آنکھیں روئی ہیں تو

مجھے سکون ملتا ہے کہ تم میرے قریب ہو۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہو گئیں

شاعر حسرت اور رشک بھرے لمحات میں یہ بات کر رہا ہے کہ دراصل اس کا خواب خوبصورت خواب ہے اسی کی نیند ہے اور اس کی خوبصورت اور مخملی رات ہے جس کے پاس تو ہے تو ہر چیز باعث سکون ہے باعث کشش ہے اور تو نہیں ہے تو پھر رات تاریک اور آنکھیں ویران اور دل بے جان ہے۔

رنج کا خوگر ہو گر انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اگر انسان رنج وغم کا عادی ہو جائے تو تکلیف کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔ اس نقطہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مجھ پر اتنے رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹے کہ مت پوچھو لیکن میں چٹان کے مانند کھڑا رہا ہوں کہ میں نے ان سے سمجھوتہ کر لیا تھا انھیں اپنا جیون ساتھی بنا لیا تھا کہ زندگی کے ساتھ اس کے مرحلوں کو بھی گلے لگانا پڑتا ہے اس میں شاعر نے اپنی آپ بیتی بیان کی ہے اپنے خط میں میر مہدی مجروح کو یہ شعر لکھا تھا 1857 کے واقعہ اور ذاتی محرومیوں کو بڑی خوبصورتی سے شعر میں ڈھال دیا۔

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اگر تم یوں ہی اس دنیا میں آہ و زاری کرتے رہو گے تو یہ بستیاں جو آج انسان سے آباد ہیں شاد ہیں وہ تمہاری ناشکری سے ویران ہو جائیں گی یعنی ہر وقت برا بھلا کہنے سے ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے اور یہ بھری بزم ویرانے میں تبدیل ہو جائے حوصلہ اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے اور تقدیر پر آنسو نہیں بہانا چاہیے۔

☆☆☆

دوسری غزل:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ جائے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

ہمارا دل گوشت پوست اور جذبات سے لبریز ایک دل ہے پتھر یا اینٹ کا کوئی مجموعہ تو نہیں لہذا ہم کو کوئی ستائے نہ ورنہ یہ انکھیں اپنے درد کا اظہار بار بار کرتی رہیں گی۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

یہ تو نہ مسجد ہے اور نہ ہی بتکدہ یہ تو محض رہ گذر ہے جہاں میں تازہ دم ہونے کے لیے چند ساعت رکا ہوں لہذا جب یہ کسی کی ملکیت نہیں تو پھر بے وجہ لوگ مجھے دق نہ کریں بے وجہ ستانا شرافت اور رواداری کے خلاف ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

دراصل جب تلک زندگی کی قید میں ہم رہتے ہیں تو غم ساتھ ساتھ چلتا ہے زندگی کے ساتھ غم کا پرانا رشتہ ہے جب یہ باریک پہلو سمجھ میں آگیا تو بھلا اس غم سے نجات کیسے حاصل کر سکتے ہیں صرف موت ہی ہم کو غم سے نجات دلا سکتی ہے ورنہ زندگی تو اس کو پالتی ہے جوان کرتی ہے پھر زندگی سے غم کی کنارہ کشی کیسی۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بولہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

اپنے حسن سلوک پر فخر کرنا چاہیے کسی ازمائے کو کیا آزمائیں۔ اس کو ہم نے ازمایا ہوتا تو وہ کتنا شرمسار ہوتا

ہے یہ تو میرا طرف تھا کہ اس کو شرمندگی نہ ہو ہم نے اس کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالا وہ تو ہمیشہ میرے لیے برا سوچتا ہے برا چاہتا ہے لہذا انسان کو اپنے عمل پر اختیار ہونا چاہیے۔ دوسرے کے اعمال کو جان بوجھ کر نہ آزمانا گویا خود اپنے حسن ظن کی دلیل ہے۔

واں وغرور عزو ناز یاں یہ خیال باس و ضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ادھر اس محبوب میں بے جا غرور ہے اور یہ میری وضع داری کے خلاف ہے کہ میں اس سے راستے میں ملاقات کروں اگر وہ اپنی بزم میں مجھے بلانا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے تو میری بھی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں اس ملاقات کے لیے بیجا راستے اختیار کروں یہ میری شان خود داری کے خلاف ہے۔

فلسفہ عشق کو سمجھنے میں مدد ملی ہے یہاں پر حسن و عشق برابر کے درجہ پر فائز ہیں جبکہ اس کے پہلے عاشق کو دوسرے درجہ پر رکھا جاتا تھا۔ اور حسن کو اول مقام پر غالب نے تقلید نہیں کی بلکہ شاعری میں ایک نئی راہ اختیار کی۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

میں مانتا ہوں کہ وہ خدا پرستی کا قائل نہیں اور نہ ہی وفا پرستی اس کا شیوہ ہے میں بھی کہاں بڑا پاکیزہ ہوں میں تو بس انسان ہوں جذبات کا پلندہ ہوں دل رکھتا ہوں اگر میں مصلحت شناسی کو جائز رکھوں تو پھر صرف یاد الٰہی میں مصروف رہوں انسان ہونے کے ناطے ہم کو ہر پھل کا ذائقہ لینا ہے کیونکہ یہ دنیا میرے تعرف میں ہے یہ شعر بھی فلسفہ عشق کو نئی جہت دے رہا ہے ایک ڈومنی کا عشق لوگوں کے لعن طعن اور پھر غالب کا نظریہ فکر ایک الگ پہچان بنا دیتا ہے۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

رونے دھونے ماتم کرنے سے بھلا اس دنیا میں کون سے کام بند ہوجاتے ہیں کسی ایک کے بچھڑنے سے کوئی مرنہیں جاتا انسان تو تعلقات اور نسل کے سلسلہ سے بندھا ہوا ہے لہذا اس کی کوئی کڑی ٹوٹتی ہے تو پھر دوسری جڑ جاتی ہے آج ایک کام نہیں ہوا تو کل دوسرا کام پورا ہوگا امید پہ دنیا قائم ہے لہذا کس کس کا ماتم کریں۔

☆☆☆

تیسری غزل:۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

میرے دکھ کا علاج کرنے والا بھی کوئی ہو جیسے کہ ابن مریم (حضرت عیسیٰ) کو یہ معجزہ حاصل تھا کہ وہ بیماروں کو شفا دیتے تھے۔ مسیحائی کا یہ انوکھا انداز کاش کوئی میرے لیے بھی مخصوص کردے۔ اور میرے تمام دکھوں کا خاتمہ کردے یعنی وہ بے مہر محبوب اپنے لطف وعنایت سے مجھے نوازے اور میرے دکھوں کا خاتمہ کردے۔

بات پرواں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

میری گفتگو سن کر تو گویا وہ خاموشی کی تصویر بن جاتے ہیں اور ترشی سے جواب دیتے ہیں لیکن انھیں یہ امید ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہیں وہ ہم خاموشی سے برداشت کرلیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میں عالم جنوں میں جانے کیا کیا کہہ گیا کچھ دل ازاریاں کچھ گستانیاں بھی ہوئیں لیکن خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ کاش کہ میری بات کو کسی نے غور سے نہ سنا ہو۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

اچھے اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو برا کہہ رہا ہو تو تم نہ سنو اور اگر کسی نے تمہارے حق میں کچھ برا طریقہ اختیار کیا ہو تو خود اس سے کوئی انتقام نہ لو بلکہ اپنے حسن سلوک کا مظاہرہ کر دیہی اخلاقیات کے عمدہ جوہر

ہیں جن کے آگے دشمنوں کے سرنگوں ہوتے ہیں۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

اگر کوئی غلط قدم اٹھانے جارہا ہو تو اسے سمجھا بجھا کر اس کو اس کے اقدام سے باز رکھوں اور اگر کوئی تمہارے ساتھ ناروا سلوک کرے تو تم اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کردو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

یہاں ہر شخص سوالی ہے ہر انسان آرزومند ہے بھلا کس کس کی آرزوئیں پوری ہوں یہ سلسلہ تو نسلوں تک پھیلا ہوا ہے بھلا کس سوال پر دوسرا سوال پیدا نہیں ہوا ہے غالبؔ نے خود ہی کہا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

حضرت خضر بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتے ہیں ایسا کہا جاتا ہے۔ شاعر مزاح پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سکندر اعظم کو راہ کس نے دکھائی یہی خضر تو تھے جنھوں نے اس انسان کو دنیا پر حکومت نصیب کرادی اگر ایسے ہی رہنما لوگوں کو ملنے لگیں تو پھر اس دنیا کا کیا ہوگا صرف ایک مالک ہوگا اور سب کی دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

توقع اور امید ختم ہو جاتے تو پھر شکوہ گلہ سے کیا حاصل توقع ہوتی اور جب پوری نہیں ہوئی تو گلہ ہوتا ہے شکوہ ہوتا ہے لیکن جب توقع ہی نہیں تو پھر کسی بات کا شکوہ وگلہ کیا جائے۔

☆☆☆

مومن خان مومنؔ

''مومنؔ اردو تغزل میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں، جس کے خود
ہی موجد ہیں، خود ہی خاتم ہیں۔ اور اپنے مطلب کو بیچ میں ادا کرنے
نام اور بات کو پھیر کر کرنا اس طرز کی خاص خصوصیت ہے۔''

ضیاء احمد بدایونی

عروس غزل کی آرائش مشاطگی اور اسے نئے روپ انداز ولب ولہجہ دینے والوں میں مومنؔ کی شخصیت نمایاں ہے۔ انیسویں صدی کے شعراء میں نمایاں ہیں۔ ان کی غزلیں، ان کی شخصیت اور ماحول کی عکاس ہیں۔ نیز انھوں نے غزل کو اس کے خاص وصف تغزل سے کبھی الگ نہیں کیا۔

مومنؔ کا شمار غالبؔ کے ہم عصر شعراء میں ہوتا ہے۔ غالبؔ ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں صرف مومنؔ کے جوہر کو تسلیم کیا ہے۔ درج ذیل شعر پر غالبؔ بے اختیار کہہ اٹھے تھے کہ کاش مومن خاں مومنؔ میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومنؔ کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ بچپن اور بڑھاپے میں مذہبی اور دیندار تھے۔ لیکن جوانی کا

پورا حصہ عشق کی دنیا میں گزرا، رندی اور شاہد بازی کے ساتھ مذہب سے لگاؤ مومنؔ کی شخصیت کے تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہ تضاد اس زمانے کے سماجی زندگی میں موجود تھا۔ ظاہر ہے مومنؔ اس سے کیونکر پاک رہتے۔ انھیں خود بھی اس بات کا احساس تھا۔

مومنؔ کو سچ ہے دولت دنیا و دیں نصیب
شب بت کدے میں گزرے ہیں دن خانقاہ میں

مومنؔ کے یہاں معاملہ بندی اور معشوق سے چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہیں جو غزل کا صحیح مزاج اور معیار رہی تھیں (مومن کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ ان کے کلام میں تابنا کی اور رس ''آبِ حیات لب و رخسار سے ہی آیا ہے۔

اس لب و لعل کی شکایت ہے
کیونکہ رنگیں نہ ہو کلام میرا

مومنؔ نے میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ کسی کی پیروی نہیں کی۔ یہ وہ غالبؔ کی طرح تنگ نائے غزل کی شاکی تھے۔ بلکہ انھوں نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا۔ اردو شاعری میں اگر کہیں تغزل اپنے عروج کمال پر نظر آتا ہے تو مومنؔ ہی کے یہاں۔ ان کے یہاں ہجر کی بے چینی اور وصل کی لذت کمال شاعرانہ کے ساتھ بدرجہ اتم ملتی ہے۔

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی
نکل ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

در اصل مومنؔ کے کلام کو جو چیز بقائے دوام بخشتی ہے وہ ان کی سنجیدہ معاملہ بندی، تغزل، نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے ان کے یہاں لکھنؤ کی خارجیت بھی ہے، دہلی کی داخلیت بھی، ان کا حسین امتزاج بھی۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری ان کی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں وہ تمام باتیں پیش کر دی ہیں، جو حسن و عشق کی دنیا میں ہوسکتی ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی کہ مومنؔ کی غزل میں بہ اعتبار مضامین و موضوعات وسعت ہمہ گیری، تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ اس میں صرف حسن و عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ہے۔ لیکن مومنؔ صاحب

طرز ہیں ان کا الگ اسلوب ہے اور اپنے مخصوص رنگ میں جواب نہیں رکھتے۔ مومنؔ کی دنیا میں عشق کی حکمرانی ہے۔ عشقیہ جذبات جو ان کے شعروں میں ملتے ہیں۔ وہ وہی ہیں جو ان کے دل پر گزرتے ہیں ان کی غزلوں میں حقیقت و واقعیت کا جلوہ ہے۔

کبھی بیٹھے سب میں رو برو تو اشاروں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یادہو

ان اشعار سے واقعیت ثابت ہوتی ہے۔ جزئیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصلی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ کسی پردہ نشیں کے عشق میں مبتلا تھے۔ ان کے بیان میں پاکیزگی اور شیرینی ہے کہیں رکاکت یا ابتذال کا پتہ نہیں۔

صبر وحشت اثر نہ ہوجائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہوجائے

مومنؔ کی شاعری میں انسان کی نفسیاتی کیفیات کے ادراک کا پرتو بھی اکثر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں وہ خصوصیت پیدا ہوگئی جسے ضیاء احمد بدایونی نے ان کے ''مکر شاعرانہ'' شاعرانہ کا نام دیا ہے۔ اس میں عاشقانہ عجز اور بلند افتادگی کچھ اس طرح سے شامل ہے کہ بت سنگ دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے مطلب کو اسی انداز سے ادا کرتے ہیں کہ محبوب کو اس میں اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں مومنؔ کی بات بن جاتی ہے۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا

جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں

اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

مومنؔ کی تمام تر شاعری داخلی شاعری ہے اور اس کی داخلیت دل نشیں ہے۔ مومنؔ کے یہاں راز داری، ہجر، وصل، رشک اور رقابت کے مضامین اپنے مخصوص خصوصیات کے ساتھ داخلی انداز میں نمایاں ہیں۔ اس کے یہاں محبوب کا سراپا ہے اس کی قد و قامت، ''زلف و گیسو'' خم کاکل، لب نازک، دین، شرم و حیا، کردار و گفتار اور تراش و خراش کا بڑا خوبصورت اور دل نشیں بیان ہے۔ اور تغزل سے بھر پور ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

مومنؔ نے تغزل میں سچائی کا عنصر پیدا کر کے اس کو رسمی اور روایتی قیدوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہے اور اپنی نکتہ یابی نازک خیالی اور شوخی ادا سے اسے ''تیر نیم کش'' بنا دیا ہے ان کا آرٹ بہت رچا ہوا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس کے پس منظر میں جمالیات بھی، نور بھی، ظلمت بھی، آن بان، وضع داری اور رکھ رکھاؤ جوان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں، وہی ان کے شاعرانہ لب و لہجہ میں جھلکتے ہیں۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے

تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک کردوں

تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

مومنؔ کے کلام میں نازک خیالی اور مضمون یا معنی آفرینی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مومنؔ بھی غالبؔ اور سوداؔ کی طرح بلند اور اعلیٰ خیالات، حلقہ شعر میں لاتے ہیں اور اکثر ان کا تخیل اس قدر بلند پروازی کرتا ہے کہ مضمون

مثل عنقا نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں نزاکت صاف ظاہر ہوتی ہے۔

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

بچاؤ آبلہ پائی کو کیوں کر خار ماہی سے
کہ باہم عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا

اس طرح کے تمام اشعار مومنؔ کی معنی آفرینی اور نازک خیالی کا نمونہ ہے۔ یہ معنی آفرینی، نازک خیالی در اصل شاعر کے تخیل اور دماغی سوچ اور فکر کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو ہمیں دعوت فکر دیتی ہے۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہوئے خود درماں ہوگا

رام بابو سکسینہ کا خیال ہے:

''مومنؔ کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے۔''

مومنؔ کی تشبیہوں میں جو انفرادیت ہے وہ ان کے تخیل اور زور طبیعت کی غمازی کرتی ہے۔

داغ خوں سے وہ میرے حیراں ہے
دامن الجھا ہے گل بے خار سے

ان کی تشبیہوں میں بڑی شگفتگی، اچھوتا پن اور شادابی محسوس ہوتی ہے۔ ان تشبیہات میں محض صوری حسن ہی نہیں معنی آفرینی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان میں طرز ادا کی رعنائی کے ساتھ خیال کی ندرت اور گہرائی بھی ہوتی ہے۔ مومنؔ کو جو چیز غالبؔ کے مدِ مقابل بنا دیتی ہے، وہ ترکیبوں کی نزاکت، حسن ترتیب اور ذوق تعمیر ہے ''خموشی اثر فغاں''، ''آشوب گاہ حشر غم''، ''آہوئے نیم خواب''، ''زبون اضطراب''، ''چشم ستارہ باز'' وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جو اپنے اندر جہان معنی پوشیدہ رکھتی ہیں۔ گرچہ مومنؔ کی دنیا محدود ہے مگر انھوں نے اس محدود دنیا

میں بھی کافی جولانیاں اور نازک خیالیاں دکھائی ہیں۔

مومنؔ کے یہاں شعریت اور ترنم تقریباً ہر غزلوں پر موجود ہیں جس سے مومنؔ کی غزلیں اردو شاعری میں سدا بہار عظمت کی حامل ہیں۔ ضیاء احمد بدایونی نے لکھا ہے۔ ''اردو شعراء میں مومنؔ نفس تغزل کے اعتبار سے جس نکتہ عروج تک پہنچ گئے ہیں دوسروں کو اس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں۔'' اشعار ملاحظہ ہوں۔

گر تری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو ٹوٹ جائیں گے ہم

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نیاز فتحپوری نے لکھا ہے:

''اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین کے کلام رکھ کر (بہ استثنائے میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومنؔ دے دو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔''

حقیقت یہ ہے کہ اردو غزل کی روایت میں مومنؔ کی آواز بالکل اچھوتی اور نئی ہے۔ مومنؔ غزل کے صحیح، مزاج داں معلوم ہوتے ہیں ان کی غزل میں زبان کی سادگی ہے، بیان کی رنگینی ہے اور آہنگ کی پر کیف نغمگی ہے۔ مومن کی نازک خیالی معاملہ بندی، معنی آفرینی، مکر شاعرانہ، اور حسن بیان ایسی خوبیاں ہیں جن کی بنیاد پر مومنؔ ایک کامیاب غزل گو کی حیثیت سے اردو شاعری میں سدا زندہ رہیں گے۔ مومنؔ کو خود بھی اپنی اہمیت کا احساس ہے۔

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومنؔ نے غزل
دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہر فن ہوگیا

پڑھتا ہے غزل کہیں جو مومنؔ
لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش

مومن خاں مومنؔ:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کی پسندیدگی تو آج بھی جوں کی توں ہے خود غالبؔ کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ فوراً کہہ اٹھے۔ ''کاش کہ مومن میرا سارا دیوان لے لیتے اور مجھے یہ شعر دے دیتے۔'' کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مومنؔ کا دور خود بڑے شاعروں کے جوہر دکھانے کا بہترین دور تھا۔ مگر اس میں بھی مومنؔ نے اپنے فن کو بیحد مقبول بنایا۔ مکر شاعرانہ اور نازک خیالی کے علاوہ ان کی شاعری میں پائی جانے والی داخلیت نے انہیں صنف اوّل کے شعراء میں نمایاں مقام عطا کیا۔

''نفس غزل میں مومن اپنے تمام ہم عصروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔''

ضیاء احمد بدایونی

☆☆☆

پہلی غزل کی تشریح:

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

پہلا شعر ــــــ دفن جب خاک .....

فلس ماہی (جب موم بتی جلتی ہے تو اس سے بوند بوند موم مثل ماہی یعنی مچھلی کے سہرے کے گول گول نظر آتی ہے) اس طریقہ عمل سے شاعر نے شعر میں خوبصورتی پیدا کی ہے جب ہم جیسے دل جلے عاشق خاک نشیں ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ اس زمین پر نمودا ہوں گے بالکل فلس ماہی کی طرح یا پھر جلتی ہوئی شمع کی موم کی بوندوں جیسے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ مرکر بھی سکون و قرار حاصل نہیں ہوگا بعد مرنے کے ہم بھی پریشان حالی کی دوسری شکل میں نمودار ہوں گے۔ کیا یہ ہماری بدقسمتی نہیں۔ عاشق جگر سوختہ کو کہیں بھی آسودگی حاصل نہیں صرف تیری قربت کے علاوہ۔

دوسرا شعر ــــــ تاب نظارہ نہیں.....

شاعر کہتا ہے کہ مت پوچھ وہ اتنا حسین وجمیل ہے کہ اس لیے اگر آئینہ دیکھا تو وہ آئینہ بن جائے گا۔ یعنی حیرانی کی دوسری شکل میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ اس کو آئینے سے دور رکھا جائے ورنہ وہ اپنی خوبصوری پر خود ہی مرمٹے گا حیرت زدہ ہوگا۔

تیسرا شعر ــــــ ہم نکالیں گے سن.....

شاعر کہتا ہے کہ خمدار زلفیں حسین چہرے کی جان ہیں۔ شاعروں نے ان گیسوؤں کے کاکلوں سے بڑے فائدے حاصل کیے گئے ہیں۔ گھونگھر والے بال میں تو قدرتی بل ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ میں ہواؤں سے انتقام لوں گا اگراس نے محبوب کے بالوں کو ذرا بھی نقصان پہنچایا۔ یعنی زلفیں اگر چہرے پر پریشاں ہوئیں تو ہواؤں کو نہیں بخشے گا۔ لیکن زلف کو پہلے ہی اپنے خمیدہ حسن سے پریشان ہو کر چہرے کو آراستہ کر رہی ہے۔ تغزل کا خوبصورت شعر کہا جاسکتا ہے۔

چوتھا شعر ــــ منت حضرت عیسیٰ .....

لوگ موت سے بچنے کے آرزو مند ہیں ، لیکن یہاں شاعر خود موت سے دور رکھنے کا خواہش مند ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی خود اتنی پریشان ہے کہ اسے موت کی آرزو نہیں رہی۔ یعنی وہ حضرت عیسیٰ سے یہ احسان نہیں لینا چاہتا کہ وہ ہم کو زندگی عطا کردیں۔ میں تو خود اس زندگی کے ہاتھوں مردہ ہوں۔ بھلا اس مری ہوئی حیات کے عوض حضرت عیسیٰ کا کیسے احسان لے سکتا ہوں۔

پانچواں شعر ــــ چاک پردہ سے یہ غمزے.....

شاعر کہتا ہے اے پردہ نشیں اگر پسِ پردہ تمہاری رعنائیاں ہم تک پہنچ رہی ہیں تو ہم پہ یہ دیوانگی طاری ہے اگر تو سامنے آجائے تو مت پوچھو کتنے گریباں چاک ہوں گے، ایک میں ہی عاشق بیمار یا دیوانہ نہیں کہلاؤں گا۔ بلکہ ہزاروں اس مرض عشق میں گرفتار ہوں گے۔

چھٹا شعر ــــ ایک ہم ہیں .....

میں ہی ایسا عاشق تھا جو اس پشیمانی کو ہضم نہیں کرسکا۔ لیکن وہ بے مہر معشوق ابھی بھی آرزو مند ہے کہ لوگ اس کو چاہیں پوجیں اور بے فیض رہیں۔ سب کو وہ خوں کے آنسو رُلاتا رہے۔ بھئی ہم کو اس عشق میں ناکامی کو برداشت نہیں کرسکے اور اپنی بھول پر آج بھی پشیمان ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ وہ اپنے ظلم وستم پہ پشیمان ہونے کے بجائے ابھی اور بھی ظلم وستم کرنے کے آرزو مند ہے وہ چاہتا ہے کہ گرفتار محبت ہو کر اور بھی زیادہ پشیمانی اور شرمندگی حاصل کرتا رہوں۔

ساتواں شعر ــــ عمر ساری تو کٹی.....

مومنؔ نے اپنے تخلص سے بے حد فائدہ اٹھاتا ہے۔ ساری عمر تو بت پرستی میں گزر گئی اب آخری لمحے میں کہاں سے میں کلمہ حق پڑھتا اور مسلمان ہوتا۔

یعنی ہمیشہ تو برے کام کیے، بری صحبت میں وقت گزارا، پھر آخری دم میں کہاں سے اچھائی حاصل کی جاتی۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ایک ہی بار میں انسان اچھا ہو جائے باوجود اس کے تمام عمر سوائے برے اعمال کے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔

دوسری غزل کی تشریح:

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

میری نظروں کی حیرانی میرے لیے وبال جان بن گئی میں لوگوں کا تماشہ بن گیا خود میری حیرانی کو آئینہ بھی دیکھا رہ گیا یعنی محبوب کے فراق میں آنکھیں حیران و پریشان تھیں کہ آئینہ دیکھا تو وہ بھی مجھے دیکھ کر دیکھتا رہ گیا۔

شاعر نے اس بات سے فائدہ اٹھایا کہ آئینہ میں ہم خود چہرہ دیکھتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ آئینہ خود ہم کو بھی دیکھتا ہے۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ لگ جانے کا چرچہ کیا

شب فراق میں جب آنکھیں بیدار رہنے لگیں تو یہ راز دوستوں پہ بھی عیاں ہوگیا کہ ضرور میری کسی خوب رو سے آنکھیں چار ہوگئی ہیں بس لوگوں کو میرے عشق کی خبر لگ گئی یعنی سب کو میرے چہرے کا حال دیکھ کر میرے دل کا حال معلوم ہوگیا۔

ان سے پری روش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

میں بھلا اپنی نگاہوں سے اس خوبصورت چہرے کا دیدار کیسے کروں میں تو اس بات پر خود شرمندہ ہوں کہ کہاں میں کہاں وہ اور اگر نگاہ شوق سے مجبور ہو کر اس پر نگاہ بھی کر رہا ہوں تو کیا باعث رسوائی نہ ہوگا لوگوں کو ماجرائے دل کا پتہ نہ چل جائے گا۔

جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے
راز میرا صبر نے افشا کیا

چلو میں اس کے ظلم و ستم کا شکوہ نہ کرونگا لیکن ذرا سوچیئے کہ میں کتنا ضبط کروں اور کیسے کروں دل تو خون خون ہے آنکھیں اشکبار ہیں پھر میرے صبر و ضبط کے بعد بھی تو سب کچھ سامنے ہے۔

کچھ بھی بن آتی نہیں کیا کیجئے
اس کے بگڑنے نے کچھ ایسا کیا

وہ راحت جاں کیا روٹھا کہ زمانہ بھی روٹھ گیا اس کے بغیر تو سانس لینا بھی دو بھر ہے زمانے کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں سب بے معنی ہے وہ ہی تو زندگی کا عنوان ہے وہی تو دلکشی کا ساماں محض ہے وہ نہیں تو زندگی رائگاں ہے۔

سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے
مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

موت کا وعدہ سب سے پکا ہے وہ کل یہ کچھ نہیں ٹالتی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایکا پیمان وفا بھی سچا ہے یہ حقیقت ہے کہ آپ نے بھی کبھی وفا نہیں کی عہد تو کیا مگر نبھایا نہیں اپکے اور وعدہ مرگ میں مماثلت ضرور ہے۔

دشمن مومن ہی رہے بت صدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

میرے نام نے مت پوچھو میرے ساتھ کیا ظلم ڈھایا میں تو ہمیشہ بت رہا یا بت ہو گیا لیکن لوگ مجھے مومنؔ کہتے رہے میں تو اس بت کا دیوانہ تھا گویا بت پرست ہو گیا لیکن نام کا کمال یہ ہے کہ میں ہمیشہ مومنؔ بنا رہا۔

☆☆☆

تیسری غزل کی تشریح:

ہم سمجھتے ہیں از مانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

تم میرے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے ہو مگر کہتے ہو کہ میں تمہاری محبت کا امتحان لے رہا ہوں یعنی کچھ نہ کچھ بہانے ضرور تلاش کرتے ہوں جس سے مجھے رنج و ملال پہونچے لیکن میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں در پردہ صرف وہی مشق ستم ہے اور کچھ نہیں۔

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

فراق یار میں زندگی کی سوچ بدل گئی نہ تو صبح جمال ہے اور نہ رنگینی شب پتہ نہیں زمانہ اتنا کیسے بدل گیا بدلا تو کچھ بھی نہیں لیکن دل عاشق چونکہ پریشان ہے فرقت کا مارا بیقرار ہے لہذا دنیا بھی خوبصورت ہونے کے باعث بے نور ہے بس انسان کا دل ہی تمام خوشی اور غم کا مرکز ہے خوش تو دنیا خوش یہ غمزدہ تو دنیا بھی اداس ویران ہے۔

برق کا آسماں پر ہے دماغ
پھونک کر میرے اشیانے کو

برق تو اسمان میں کوندتی ہے مگر شاعر نے فائدہ اٹھاتے ہوئے شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے میرے آشیانے کو جب سے بجلیوں نے برباد کیا ہے اس کے غرور کی انتہامت پوچھو یہ بھی آسمان پر پہونچ گئی ہیں یعنی وہ کمتر چیز بھی آج مغرور ہوگئی کہ انسان کا نشیمن پھونک ڈالا۔

روز محشر بھی ہوش گر آیا
جائیں گے ہم شراب خانے کو

اگر قیامت کے روز مجھے ذرا بھی ہوش آیا تو اس روز ہم بھی شراب پینے ضرور جائیں گے زندگی بھر تو میکدہ

آباد کرتے رہے ہوش کھوتے رہے لیکن بعد مرنے کے بھی ہوش میں آئے تو شراب کا جام ضرور اٹھائیں گے۔

یہ شعر دو معنی ہے صوفیانہ مسلک میں ہے کہ تا عمر شراب معرفت پیتا رہا مگر بعد مرنے دوبارہ زندہ کیا گیا تو بس اسی شراب معرفت سے اپنی پیاس بجھاؤنگا پہلے بھی اسی خدا کی یاد میں مصروف تھا دنیا سے بے خبر تھا اور بعد میں بھی ذکر الہیٰ میں مصروف رہونگا۔

سن کے وصف اسپر مر گیا ہمدم
خوب آیا تھا غم اٹھانے کو

محبوب کی تعریف کیا سنی اسپر مرمٹا حیرت کی بات ہے کہ کہتا تھا کہ میں غم حیات کا بوجھ اٹھانے آیا ہوں لیکن وہ تو پہلے ہی مرمٹا پھر غم جاناں کا بوجھ کیا اٹھائے گا۔

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں
آسماں کے ستم اٹھانے کو

کاش کوئی دن تو ایسا ہوتا کہ ہم دنیا میں فراغت کا کوئی لمحہ گزار سکتے آسماں تو ہمیشہ ہی ہم گو گرفتار بلا رکھتا ہے اور سکون و آسودگی حاصل نہیں ہونے دیتا دراصل زندگی ہے تو پھر مصائب اور دشواریاں بھی ہونگی لیکن شاعروں نے ہمیشہ آسمان کو مخاطب کر کے اپنے شکوہ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور انسان بھی کم و پیش ایسا نہیں کرتا ہے۔

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

اے مومن اب اس عشق محبت کا چکر چھوڑ اس بت سے جی ہٹاؤ اور بندگی خدا میں مصروف ہو جاؤ کیونکہ اس سے وفا کی تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا مگر خدا کی محبت میں مرمٹے تو بہت کچھ حاصل ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

اردو نظم

''شعر کلام موزوں چند شعروں کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون پر ہوں''

انسان اور فنونِ لطیفہ کا ایک دوسرے سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ فنون لطیفہ میں بھی اس کا شدید جذباتی لگاؤ موسیقی اور شاعری سے ہے چنانچہ بچوں کو سلانے کے لئے مائیں لوریا سناتی ہیں جس کے اثر سے مسحور ہوکر بہت جلد نیند کی آغوش میں پہونچ جاتے ہیں۔ شاعری اسی موسیقی کی روح کہی جاسکتی ہے دنیا کی ہر قوم کسی نہ کسی انداز میں نثر کی بہ نسبت شاعری کی دلدادہ رہی ہے انسان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی شاعری سے ہوتی ہے نظم بھی اسی شاعری کا حصہ ہے۔ نظم کی تعریف یوں کی جاتی ہے۔

نظم کے لغوی معنی لڑی کے ہیں۔ جس میں موتیوں کو پرویا جاتا ہے۔ گویا ان کو ایک دھاگے کی لڑی میں پرودیا گیا جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ بھی ہوگیا اور وہ آراستہ بھی ہوگئی۔ لیکن شاعری میں نظم سے مراد وہ اصناف اور وہ اسالیب ہیں جن میں کسی خاص موضوع پر ربط اور تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی نظم کے لئے خیال کا تسلسل اور وحدت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں۔

> ''نظم مسلسل روشنی سے نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح نشیب و فراز ہیں کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں مناسب اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ضروری ہوتی ہے''۔

احتشام حسین لکھتے ہیں۔

> ''اردو ادب میں نظم کا لفظ دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہورہا ہے۔ عام حیثیت تو یہ ہے کہ ہر شاعرانہ تخلیق کو نظم کہہ سکتے ہیں چاہے وہ مختصر ہو یا طویل یہ بھی شرط نہیں کہ وہ کسی خاص شکل میں ہوا اپنے دوسرے مفہوم میں لفظ نظم ایک مسلسل مربوط اور اتقاء کی شاعرانہ تصنیف کے لئے استعمال ہوتا ہے''۔

اردو نظم کی بھی اپنی روایات اور اپنی تاریخ ہے۔ ان میں سے اکثر کچھ موضوعات کے لئے مخصوص ہیں اپنے عہد اپنے اپنے

زمانے میں انہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابتدا کی دور میں کچھ خاص اسالیب کا رواج تھا۔ جیسے مسدس، مخمس، ترجیع بند، وغیرہ شروع میں ان کے اصول اور ضابطے سخت تھے تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی ایک ہی دائرہ میں رہ کر شاعری کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حکومت کے ساتھ زندگی بدلی، حالات بدلے سیاسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ نظم نے بھی اپنے پیرائے کو بدلا۔

موضوع کے اعتبار سے نظم جدید اس نظم کو کہتے ہیں جس میں جدید زندگی کو کہیں گے جس میں پرانے ضابطوں اور قاعدوں سے آزادی ہو۔ اور کسی مسئلہ یا کسی نئے موضوع کا بیان ایک ربط اور تسلسل کے ساتھ کیا گیا ہو۔

جدید نظم کا آغاز پنجاب کے ایک انگریز عہدیدار کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام وہ مشاعرہ جہاں اردو نظم کا آغاز ہوا اردو نظم کی تاریخ میں اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس جلسے میں غزل کے بجائے نظم پر جو تقریریں ہوئیں اس سے نئے شعراء بہت متاثر ہوئے اور نظمیں پڑھی جانے لگیں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ مولانا حالی نے برکھا رت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف کے عنوانات سے پڑھیں۔ ان میں خیالات کا عکس ہے۔ محمد حسین آزاد اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی ضامن کنتوری وغیرہ نے انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا اور اردو کو انگریزی سے روشناس کرایا۔ بعد میں شرر کے رسالہ دلگزار اور سر عبدالقادر کے رسالہ مخزن نے بھی جدید نظم کے فروغ میں حصہ لیا۔ یہی نہیں اسی دور میں شرر نے اپنے رسالہ میں نظم معریٰ اور نظم آزاد کے تجربے کئے۔

(۱) نظم معریٰ اس میں نظم کو کہتے ہیں جو ردیف قافیہ کی پابندی سے آزاد ہو لیکن شروع سے آخر تک ہر مصرع میں وزن کے تقاضوں کی پوری پابندی ہوتی ہے۔

(۲) نظم آزاد میں اس نظم کو کہتے ہیں جو وزن اور قافیہ کے روایتی ضابطوں سے یکسر آزاد ہیں۔

رسالہ مخزن میں انگریزی نظموں کے ترجموں اور نظم کے نئے تجربوں میں اردو نظم کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مثال کے طور پر نظم طباطبائی کی ایک نظم "مرگ انبوہ" کے ہر بند کا چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے اور ہر بند کے پہلے تین مصرعوں کے قافیے جدا جدا ہیں۔

خالق نے بنائی ہے زمیں سب کے لئے
لازم تھا کہ ہو تاج ونگیں سب کے لئے
یا پیٹ کی روٹی ہیں سب کے لئے
ایک دست نگرِ ہے ایک مالک مختار

اسی طرح ان کی ایک نظم برسات کی فصل کے ہر بند کا پہلا تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہے

رت ہے برکھا ساون کی راتیں
چل رہی ہے ہوا سائیں سائیں
ابر کرتا ہے گردوں سے باتیں
آرہی ہے صدائیں سائیں

مخزن کے دیگر بڑے شاعروں میں اقبال چودھری خوشی محمد ناظر، غلام محمد بھیک نیرنگ، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خان تلوک چند محروم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اردو نظم کو نئی وسعت دی۔ اقبال کی ابتدائی نظموں میں مثلاً ہمالہ، لالہ رخ، ایک آرزو، شمع و پروانہ، شعاع امید وغیرہ میں انگریزی نظموں کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے نظیر اکبر آبادی، سودا، میر، میر انیس، اور دبیر کے کلاسیکی فن سے فائدہ اٹھایا، چکبست نے اپنی نظموں کے ذریعے ملک کی بیداری کا کام کیا۔ بعد میں اس کارواں میں بہت سے نظم نگار شریک ہوگئے۔ پہلی جنگ عظیم اور روس انقلاب کی کامیابی سے محنت کش طبقہ فارم میں آ گیا تھا ایک نئے شعور نئے احساس کا آغاز ہوا۔ ان لوگوں میں ایک طرف جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، حفیظ، شاعر نظامی اور احسان دانش شریک تھے۔ جو مغربی شعروادب سے الگ تھے، دوسری جانب عبدالرحمان بجنوری، عظمت اللہ خان، اختر شیرانی تصدق حسین خالد اور ڈاکٹر تاثیر تھے۔ جو مغربی فکروفن سے متاثر ہوکر لکھ رہے تھے۔ نظم اب وقت اور فرد کی آئینہ بن گئی۔

ترقی پسند تحریک اور دوسری تحریکوں کے اثر سے اردو نظم میں تبدیلی ہوئی ترقی پسند تحریک نے انسانی مساوات اور انسان دوستی اور ملک کی آزادی میں پیش پیش ہونے کا حوصلہ دیا۔ اقبال اور جوش نے نظم کو بہت مستحکم بنادیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مجاز، کیفی اعظمی، فیض احمد فیض معین احسن حذبی، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جانثار اختر، علی جواد زیدی اور ساحر لدھیانوی نے ملک میں سماجی زندگی کے اتھل پتھل سے پیدا ہونے والے سنگین حالات کو موضوع بنایا اپنی شاعری میں جگہ دی۔ دوسرے وہ شعراء جو براہ راست ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے ان میں میراجی، ن۔م۔راشد، اختر الایمان، اور سلامی مچھلی شہری، وامق جونپوری کے نام سرفہرست ہے۔

جدید شاعری کی دین آزاد نظم ہے جو ہر طرح کے قوانین اور بندشوں سے آزاد رہی ہے۔ مخدوم، ساحر نے آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ ان نظموں میں موزونیت اور حسن دونوں سے مثال کے طور پر ن۔م۔راشد کی ایک نظم ''جرأت پرواز'' کا یہ بند

بٹ گئے میری تمناؤں کے پروانے بھی
خوف ناکامی و رسوائی سے
حسن کا شوۂ خودداری سے
دل بیچارہ کی مجبوری و تنہائی سے
میرے سینے ہی میں بے جان رہیں آہیں میری
کرسکیں روح کو عریاں نہ نگاہیں میری

یا فیض احمد فیض کی نظم کا یہ بند

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے میں چھوڑ دو

سب نوچ لو
بے کل پھولوں کو
شاخوں پہ مہکتے مت چھوڑو
یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی

آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات میں تبدیلی ہوئی اس کا اثر شعروادب پر بھی پڑا نئی پود نے پرانے طرز کو چھوڑ کر نئے نئے تجربے کئے انفرادیت کا جذبہ کارفرماں تھا۔ اختر الایمان، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، بلراج کومل، وحید اختر، عمیق حنفی جیسے نظم گو شعراء نے نظم کو نئی جہت سے آشنا کیا۔

☆☆

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

نظیر اکبر آبادی

''نظیر اکبر آبادی ہماری زبان کے پہلے کوہ کن ہیں، جس نے عوامی
زندگی کے تیشے سے زبان کے روایتی تصور کے پہاڑ کا قلب چیر کر
مشاہدہ کی جوئے رواں جاری کردی۔'' (ابوالخیر کشفی)

سیّد ولی محمد نظیر اکبر آبادی کی پیدائش دہلی کی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد آگرہ منتقل ہوگئے۔ شعر کہنے کی خدا داد صلاحیت موجود تھی۔ کسی سے اصلاح نہ لی اور نہ ہی کسی دبستان سے وابستہ تھے۔ بلکہ وہ خود ایک دبستان تھے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ بنائی عوام کے مسائل سے جڑے اور عوامی شاعر بن گئے۔

اردو شاعری کی تمام اصناف میں نظم کی ادبی اہمیت کو بہت تاخیر کے بعد تسلیم کیا گیا۔ اردو نظم کا آغاز ہندوستان کی جنگ آزادی کے بعد سے باقاعدہ طور پر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہماری شاعری میں نظم ایک باقاعدہ صنف سخن کی حیثیت سے پیدا ہو چکی تھی لیکن اردو کے ناقدین نے اس شعری کارنامے کو اہمیت کے قابل نہیں سمجھا۔ نظیر اکبرآبادی نے سو برس قبل ایک ایسی شاعری کی تخلیق کی، جس کا رشتہ عوام سے، جمہوریت سے اور انسانیت سے تھا۔ اگر ادب حقیقی معنوں میں سماج کا آئینہ ہے تو یہ تعریف نظیر کی شاعری پر پوری طرح صحیح اترتی ہے۔

اردو شاعری میں زندگی اور خارجی دنیا کی صحیح نمائندگی کا آغاز نظیر اکبر آبادی کی شاعری سے ہوا۔ نظیر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی اور اس کے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ کسی ایک طبقے سے ان کی ہمدردی نہیں

تھی، بلکہ نظیر نے ہر طبقے کے لوگوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں کی۔ اردو شاعری کو ایک جمہوری مزاج عطا کیا۔ خیالی دنیا سے اسے باہر نکالا۔ زندگی اور اس کی سچائی سے روشناس کرایا۔ ایک عام آدمی کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا کر اس کی کمزوریوں بلندیوں اور انسان دوستی کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ہر جگہ عوام کی زبان استعمال کی۔ اس لحاظ سے وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جو اپنی شاعری کا تانا بانا خاص ہندوستانی عناصر سے تیار کرتے ہیں۔

احتشام حسین لکھتے ہیں:

''نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کے محل کے اندر ایک چور دروازے کی بنیاد ڈالی اور پہلی دفع ہم بادشاہوں، نوابوں اور وزیروں کے ساتھ اردو شاعری کی بساط پر عام انسانوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں''۔

نظیر اکبر آبادی نے زیادہ تر نظمیں لکھیں۔ قناعت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ چونکہ کسی دربار سے منسلک نہیں تھے اس لیے حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اس حلقہ میں امیر و غریب، ہندو مسلمان چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہ تھی۔ نظم کو انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ غریبی کی زندگی کو فطرت کی رعنائیوں کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کی تکلیفوں کا ذکر واعظانہ اور ناصحانہ نظمیں بھی لکھیں۔ مذہبی نظموں میں جہاں اسلام کے بعض رہنماؤں کا ذکر کرتے ہیں وہیں گرونانک کو بھی یاد کرتے ہیں ان کی کلیات کا اچھا خاصہ حصہ ہندو مذہب کی روایات و تیوہاروں کے رنگین اور دلکش بیان کے لیے وقف ہے۔ ''میلے کی سیر'' اور ''ہولی'' اس کی مثال ہیں۔ اپنی نظموں کا مواد روزانہ کی زندگی سے حاصل کر کے اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مقامی رنگ کافی ملتا ہے اور ہم انھیں عوامی شاعر بھی کہہ دیتے ہیں۔

تخیل اور تصور کے مقابلے میں اپنے مشاہدے سے زیادہ کام لیتے ہیں اور جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسے روح کی گہرائی تک محسوس کر کے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

''دنیا کو کتاب سے پڑھا اور استاد سے سیکھا بھی جاتا ہے۔ مگر دل زندہ ہو تو آنکھوں سے اور کانوں سے

پیا بھی جاسکتا ہے۔''

نظیر نے اپنی نظموں میں بہارخزاں، برسات، میلے ٹھیلے یا تیوہاروں کا ذکر کرتے ہیں تو فرضی اور خیالی سماں پیش کرنے کے بجائے وہ ہندوستانی موسموں تیوہاروں اور روایات کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے غزل گوئی ترک کرکے نظم گوئی اختیار کی۔ ان کے کلام کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کی تلمیحات اور تشبیہات بھی خاص ہندوستانی ہیں ان کا موضوع عوامی زندگی ہے ان کی نظموں کا انداز صاف اور سلیس ہے بلکہ فطری ہے۔ موجودہ نیچرل شاعری نظیر اکبرآبادی کا فیضان ہے۔ مثال کے طور پر ''برسات کی بہاریں'' نظم کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہم سچ مچ ہندوستانی برسات سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔

مارے ہے موج ڈابر دریا ڈونڈ رہے ہیں
مورہ پپیہے کوئل کیا کیا ڈمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں ندیاں نالے امنڈ رہے ہیں
برسے ہے مینھ جھرا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہندوستان کے موسموں کا بیان نظیر نے جس حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے، اس کی مثال ہمیں کہیں اور نہیں ملتی، گرمی کی شدت، جاڑے کی خوشگوار اور اذیت ناک کیفیت اپنے اصلی رنگ میں ان نظموں میں نظر آتی ہے۔ ان کے بیان میں نظیر نے سماج کے ہر طبقے کا یکساں خیال رکھا ہے۔ ان موسموں کے اثرات کس انداز میں ان لوگوں پر پڑتے ہیں، اس کا بیان بڑا نفسیاتی انداز میں کیا ہے۔ اس طرح سے انھوں نے اس تضاد کو بھی نمایاں کیا ہے جو سماج کے امیر و غریب طبقے کے درمیان موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان مسئلوں کو اپنی شاعری میں اٹھایا جو اس تضاد کا سبب ہے۔

زندگی کا بنیادی مسئلہ بھوک ہے اس کے اردگرد زندگی کے دیگر تمام مسائل گردش کرتے ہیں۔ نظیر نے ایک

ماہر اقتصادیات کی طرح سے اس مسئلے کا سبب بیان کیا ہے۔ انھوں نے سماجی جرائم کی تمام تر ذمہ داری کو اسی بنیادی مسئلے کی دین بتایا ہے۔ انسان چوری پر کیوں آمادہ ہوتا ہے۔ دوسرے کا حق کیوں چھینتا ہے۔ ظلم اور نا انصافی کا چلن کیوں ہوتا ہے۔ یہ سب اسی بھوک اور غریبی اور معاشی بدحالی کی پیدا کردہ ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ انھوں نے ایک غریب کی نگاہ میں چاند کو بھی روٹی کی حیثیت سے دکھایا ہے۔ کیونکہ انسان جب بھوکا ہوتا ہے تو فطرت کا حسن اس کی نگاہوں میں بے معنی ہوتا ہے۔

نظیر کی شاعری میں ان کا جمہوری مزاج اور بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے مسلم تیوہاروں، مسلم بزرگوں کے مقابلے میں ہندو تیوہاروں اور ہندو بزرگوں کی شان میں زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اوپر کسی کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ انھوں نے جو دیکھا، محسوس کیا، اس کو شعر میں سمو دیا۔ ان کی اس حقیقت پسندی کے بارے میں احتشام حسین نے لکھا ہے:

''نظیر پہلا شاعر ہے، جو زمین پر کھڑا معلوم ہوتا ہے'' نظیر نے بیانیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ ایک مصور کی طرح خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ اس سلسلے میں ''ہولی''، ''آگرہ کی تیراکی''، ''دیوالی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر ہولی کا ایک بند ملاحظہ ہو

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تک دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر اکبر آبادی نے جس موضوع پر قلم اٹھائے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کے نقوش جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ان موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے ناصحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی باتیں ایسے فطری انداز میں ہماری نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی باتیں ہمارے

دلوں پر ہمیشہ کے لیے اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کی باتوں سے مایوسی و افسردگی کے بجائے ہمارے دلوں میں ایک طرح کی رجائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم زندگی کی آگاہی حاصل کر کے نئے حوصلے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری نے نظیر کے اس رجائی پہلو کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

''نظیر کے کلام کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا ہو۔ جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا، جو اپنی رفاقت سے ہمارے اندر تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ زندگی صرف دکھ اور درد کا نام نہیں ہے۔''

نظیر کے یہاں زندگی سے انسیت کا پہلو ہر جگہ اجاگر ہے۔ یہ انسیت مرکزی حیثیت لیے ہوئے ہے، ''روٹی''، ''آدمی نامہ'' وغیرہ نظمیں لکھ کر انھوں نے ثابت کیا کہ وہ اسی جیتی جاگتی دنیا کا حصہ ہیں۔ انھوں نے اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں ''بنجارہ نامہ'' کا یہ مصرع

''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ''

ضرب المثل بن گیا ہے۔ اس نظم میں نظیر نے دنیا پر ایک مفکر کی حیثیت سے نگاہ ڈالی ہے کہ دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ دنیا ایک جنگل کی طرح ہے جہاں تھکا ہارا مسافر کچھ دیر کے لیے آرام کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات کی تعلیم و تلقین کی ہے کہ انسان کو اس دنیا سے محبت نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کی زندگی نا قابل اعتبار ہے اس کا سارا عیش و ٹھاٹھ سب اسی دنیا میں رہ جائے گا اور وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے لوٹ جائے گا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجاکر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اس نظم میں نظیر کی مشہور نظم ''شہر آشوب'' ان کے سماجی شعور اور انسانی درد مندی کی بہترین مثال ہے۔ آگرہ کے قحط سالی پر بھی انھوں نے عوام کے دکھ درد اور آلام ومصائب کو نہایت خلوص اور سچائی سے بیان کیا۔ نظیر نے اس نظم میں کسی سیاسی انقلاب کے بجائے ایک تہذیب کے زوال پر آنسو بہائے ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

''شہر آشوب نظم ہی نہیں اکبر آباد کی روح کی پکار ہے۔ اور یہ پکار بعض محلوں اور کوٹھوں کی نہیں ہے، دوکانداروں، فقیروں، کاریگروں، مصوروں اور شاعروں کی پکار ہے۔''

نظیر اکبر آبادی موضوع کے مطابق لب و لہجہ اپناتے ہیں۔ چونکہ ان کی شاعری کا رنگ عوامی زندگی سے بہت قریب ہے اس لیے انھوں نے زیادہ تر وہی زبان استعمال کی ہے جو عوام میں رائج تھی۔ آسان اور سادہ زبان استعمال کی۔ مشکل اور ثقیل زبان سے پرہیز کیا ہے۔ وہ زبان ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے وہ وہی لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں جو مناسب ہوں۔

نظیر کی شاعرانہ اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اردو میں سب سے پہلے عوامی اور جمہوری شاعری کی بنیاد رکھی۔ اشتراکیت اور جمہوریت آج جس چیز کی تعلیم دے رہی ہے نظیر نے نہ صرف اس کا ذکر کیا بلکہ اپنی زندگی میں اس کو عملی شکل بھی دی ہے۔ نظیر کی انسان پرستی نے ان کی شاعرانہ عظمت کو نکھارنے میں بڑی مدد کی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام سے اپنی شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

☆☆☆

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے اس کے عہد کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی حساس شاعر یا ادیب اپنے زمانے کے میلانات سے بے تعلق نہیں ہوسکتا، اس کا شعور ایک مخصوص عہد کے سیاسی سماجی تہذیبی حالات میں پروان چڑھتا ہے۔ حالیؔ کا دور ہماری جنگ آزادی کے بعد کا دور ہے۔ تہذیبی اور سماجی قدریں بدل رہی تھیں، خیالات و افکار تغیرات کا شکار ہو رہے تھے، برطانوی نظام کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط ہو چکی تھیں، مغربی تہذیب و تمدن کی رنگ آمیزی مشرقی تہذیب پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، مشرق و مغرب کا ذہنی و تہذیبی تصادم شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، قدیم اور جدید تہذیب کا یہ ٹکراؤ ہماری سیاسی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ مغربی تہذیب کے تسلط نے مشرقی تہذیب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس تہذیبی زوال کا اثر شاعری پر بھی پڑا، لوگوں میں اپنی تہذیب کی بربادی اور سماجی پستی کا احساس شدید ہو چکا تھا۔ ایسے وقت یہ احساس جڑ پکڑتا گیا اور ایک صحت مند ادبی روایت کے قیام کی ضرورت ہے، جو لوگوں کی احساس کمتری کو دور کرنے میں مدد دے سکے۔

جنگ آزادی سے قبل ہماری شاعری میں ایسی قدریں موجود تھیں، جو اس کے صحت مند ارتقاء کے لیے مضر تھے، ان میں نمایاں بات یہ تھی کہ شاعری کو ذہنی آسودگی تفریح کا وسیلہ بنایا گیا، کچھ شاعروں کو چھوڑ کر ہر ایک کے یہاں مبالغہ آرائی، لفاظی اور غیر فطری اندازِ بیان تھا، جو شاعروں کا عام مزاج بن گیا تھا۔

حالؔی غالبؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے استاد سے طرزِ ادا کا بانکپن ، ندرتِ فکر حسنِ تخیل، گفتار کا تیکھا انداز اور شیفتہؔ سے سادگی زبان و بیان کواپنایا اور اس کو اپنی شاعری میں اس طرح سے سمویا کہ وہ ان کا انفرادی رنگ بن گیا۔ سرسیّد اور علی گڑھ تحریک نے حالؔی کی شاعری میں تابندگی پیدا کی۔ وہ دور ہندوستان میں انگریزی ادب کے تعارف کا تھا۔ حالؔی نے اپنے ایک انگریز استاد کی مدد سے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے حالؔی پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ شاعری کا میدان صرف غزل تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ حالؔی کے پہلے اور ان کے دور تک اردو غزل میں جن چیزوں کو نظم کیا جاتا تھا، حالؔی اس کے بالکل منکر تو نہ تھے، لیکن وہ غزل کی تنگیٔ مضامین سے شاکی ضرور تھے۔ ادب اور شاعری کے لیے زندگی کی ترجمانی اخلاقی اور معاشی قدروں کا احترام سماجی اور قومی مسائل، غم دوراں، کائناتی عشق ہے۔ ہجر و وصال نہیں۔ عام انسانوں کے دلوں میں اس وقت وطن پرستی کے جذبے بیدار ہو چکے تھے۔ حب الوطن کے نغمے ہندوستان کی فضا میں گونج رہے تھے۔ حالؔی کو اپنے ادب سے یہی گلہ تھا کہ اس میں محض تخیل سے کام لیا گیا تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ حالؔی کو ان مضامین اور موضوعات سے بالکل نفرت تھی لیکن وہ اس میں تبدیلی کے خواہش مند تھے۔ وہ نیچر اور اس کے متعلق مضامین پر اردو شاعروں کی زیادہ سے زیادہ توجہ چاہتے تھے۔ چونکہ نظم کی حیثیت مضامین کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اس لیے حالؔی نظم نگاری پر زور دے رہے تھے۔ محمد حسین آزادؔ کی رفاقت نے حالؔی کے لیے یہ مسئلہ آسان کر دیا۔ اور ان کی کوششوں کی مدد سے لاہور میں ایک غیر طرحی مشاعرے کی بنیاد پڑی۔ جس میں مختلف موضوعات پر لوگوں نے نظمیں پڑھیں۔ اپنی نوعیت کا یہ اردو ادب کی تاریخ میں پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرے میں حالؔی نے بھی کئی نظمیں پڑھیں جو ''برکھا رُت''، ''نشاط امید'' اور حب وطن کے عنوان پر تھیں۔ حالؔی نے زندگی کی خارجی حیثیت سے مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں کو شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی۔

حالؔی اُردو میں پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے حقیقت ، صداقت ، زندگی کے روشن اور صحت مند رُخ کو پیش کیا۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حالؔی سے بہت پہلے نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کی قدیم روایتوں سے بغاوت کی ،لیکن ان کی منزل واضح نہ تھی۔ انھوں نے یہ بغاوت شعوری طور پر نہیں کی ، حالؔی کا مقصد

اور منزل روشن اور واضح تھی اور انھیں اس پر یقین تھا۔ انھوں نے زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو بے نقاب کیا اور اردو میں صحت مند تعمیری اور مقصدی ادب کا اضافہ کیا۔

حالؔی کو جدید اردو نظم کا خالق کہنا چاہئے۔ انھوں نے شاعری کی نئی ڈگر اختیار کی۔ اگر ترقی پسندی کو اس کے صحت مند مفہوم میں استعمال کیا جائے تو حالؔی پہلے ترقی پسند شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری کی پرانی روایت سے بغاوت کی۔ یہ بغاوت ظاہری کم اور معنوی زیادہ ہے۔ وہ نظم کے شدید حامی تھے۔ ان کے عہد میں مختلف نظریوں کا ٹکراؤ تھا۔ انھوں نے اس نظریاتی تصادم سے فائدہ اٹھایا۔ وہ اردو غزل کی ہیت پن مواد کے خلاف تھے۔ حالؔی کی غزلوں کا حسن ایسی غزلوں میں ہے جنھیں انھوں نے نظموں کا روپ دے دیا ہے۔ حالؔی کا مرثیہ ان کی ایسی ہی غزل کی ایک عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں پاکیزہ اور نمائندہ سماج کی تشکیل کی کوشش کی۔ انھوں نے شاعری کے کینوس کو کشادہ کیا۔

حالؔی کی غزلوں میں ایک مخصوص قسم کا تغزل ملتا ہے۔ ان کے یہاں زبردستی تخیل کی پرواز نہیں ہے۔ تشبیہ و استعارے نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی سچائیاں اور انسانی جذبات و احساسات کو کامیاب مصوری ملتی ہے اس لیے حالؔی کی کہی ہوئی بات ہر شخص کے اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے۔

نمونہ کلام

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی

دل چاہتا نہ ہو تو دعامیں اثر کہاں
بار بار دیکھ چکے تھے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکانہیں کھایا جاتا
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازیٔ شب ہجراں میں نہیں

حالؔی کی شاعری غیر معمولی ضبط وخودداری کا پتہ دیتی ہے۔اور جو چیز اردو کے دوسرے شاعروں سے ممتاز بناتی ہے، وہ عقل اور جذبات کے درمیان ایک توازن ہے۔ اپنے وقت کے غزلوں کو گویاازسرنوتعمیر کیا ہے اور ان میں نئی کیفیتیں بھردی ہیں۔ ان کی شاعری میں لطف، سادگی، اور نرمی اور سنبھلی ہوئی رنگینی پائی جاتی ہے۔ حالؔی اپنے راز کوافشانہیں کرنا چاہتے ہیں، زیرلب کچھ کہ کر رہ جاتے ہیں۔

حالؔی کی شاعری میں دوچیزیں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ واقعیت اور عقل پسندی ، اس لیے ان کے کلام میں توازن اور ٹھہراؤ ملتا ہے۔نظم میں حالؔی کا سب سے نمایاں کارنامہ ''مسدس مدّ و جزر اسلام'' یہ تبلیغی یا تنظیمی ادب کے عنوان کی چیز ہے۔اس میں جہاں تک پیغام ہے وہاں تک شاعری نہیں ہے۔اس کے اہم ترین ٹکڑے وہ ہیں، جس میں یا تو اسلام کے گزشتہ شان وشوکت کی تصویر دکھائی گئی ہے یا ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ ابتری ہے اور پستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہی شاعری کے مکمل نمونے ہیں۔ وہی انسانی دردمندی اور دل سوزی دلی جذبات کی سنجیدگی وہی دھیما اور تھما ہوا لہجہ اور زبان کی سادگی اور بے رنگی جو ان کی قدیم و جدید غزلوں یا ''حب وطن''، ''مناجات بیوہ''، جیسی نظموں میں ملتا ہے۔ مسدس نے اردو شاعری میں انقلاب برپا کردیا۔ اس میں اردو شاعری کا روایتی انداز نہیں ہے۔ اس میں رمزیہ شاعری کی وسعت خیال ، عروج وزوال اخلاق وتہذیب کی شعریت کے نمونے ہیں۔

''مرثیہ غالب'' میں حالؔی نے غالبؔ کی شخصیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ ہندوستان کا ادبی سماج اور تہذیبی پس منظر اجاگر ہوتا ہے۔ مرثیہ زبان کی سادگی کے باوجود زور بیان فصاحت ، سلاست ، سادگی اور تاثیر کے

اعتبار سے اردو کے عمدہ ترین مرثیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر شعر سادگی اور تاثیر سے بھر پور ہے۔ جذبات کا طوفان ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ تاثرات کا بہاؤ ہے کہ شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے۔

دل میں مدّت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتم یارِ غمگسار ہے آج

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کسی کی باتوں سے دل کو بہلائیں

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

اس سے ملنے کو ہم یاں آتے تھے
جاکے دلّی سے آئے گا اب کون

حالؔی نے اپنی مثنویوں میں جو مواد نظم کیا ہے، وہ قدیم اردو مثنویوں کے موضوعات سے مختلف ہے۔ حالؔی کی مثنویوں میں اصلاحی جذبہ کارفرما ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کی فرضی داستانوں سے گریز کیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔ لیکن شاعری کی اداس قلبی میں انھوں نے دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ''حب الوطن''، ''برکھا رُت'' میں ہندوستان کی فضا کی تصویر کشی ہے۔ ''مناجات بیوہ''، ''چپ کی داد''، ''رحم و انصاف'' میں اصلاحی جذبہ نمایاں ہے۔ اپنی کتاب مجالس النساء لکھی جس کی زبان نہایت آسان اور خالص عورتوں کی سی ہے۔ عورتوں کی عظمت کا اعتراف انھوں نے ''چپ کی داد'' میں اس طرح سے کیا ہے۔

اے ماؤ بہنو بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمہیں دکھ سکھ کی راحت تم سے ہے

تم آسن ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم ناچار کی

دولت ہو تم نادار کی، عسرت میں عشرت تم سے ہے

حالؔی نے یہ بھی اعتراف کیا کہ آج تک دنیا میں جتنے پیغمبر ولی، صوفی، فلسفی پیدا ہوئے سب کو اونچے مقام پر پہنچانے والی عورت تھی

سرکار سے مالک کے جتنے پاک بند ہیں بڑھے

وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں اوپر چڑھے

اور بعد میں یہ بھی کہا کہ دنیا میں سب سے بلند ترین مقام عورت کا ہی ہے

کی تم نے اس دارالمحن میں جس محل سے بسر

زیبا ہے گر کہئے تمہیں فخر بنی نوع بشر

مجموعی طور پر حالؔی کی شاعری اردو اور شاعری میں انقلاب لائی اور ایسے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔

☆☆☆

انتخاب مسدس

پہلا بند:۔

وہ قومیں جو آج ہماری غمخوار ہیں ان کی طبیعت اور درندوں کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں تھا جہاں آج عدل و انصاف کی بات ہوتی ہے وہ ظلم و زیادتی کا گڑھ تھا مرکز تھا آما جگاہ تھا۔ ہر طرف بربریت پھیلی تھی انسان کی زندگی اس پر بوجھ بن گئی تھی۔ جو آج چرواہے ہیں جانوروں پر جنکی حکمرانی ہے وہ دراصل انسان کی شکل میں بھیڑیے تھے ان کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے جو نظر آتی ہے دھوکہ دنیا انکا فرض اولیں تھا۔

دوسرا بند:۔

جہاں اب بے شمار فنکار اور ہنر مند رہتے ہیں جہاں ایک سے ایک قابل انسان رہتے ہیں جو اپنا علم دوسروں تک پہونچاتے رہے ہیں جہاں خدا کے فضل و کرم سے رحمتوں کی بارش ہے جہاں آج دولت کی فراوانی ہے چاروں طرف دولت ہی دولت ہے وہاں تہذیب کا نام و نشان بھی نہ تھا انسان کا کوئی معیار نہیں اچھائی برائی کی کوئی پرکھ نہیں علم کی روشنی نہیں تھی وہ موج نہیں تھی جو ہمشہ چلتے رہنے کا پیغام دیتی ہے علم درجہ بدرجہ آگے بڑھے تو اچھا ہے، جمود طاری ہو گیا تو شاید زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔

تیسرا بند:۔

کوئی ایسا طریقہ یا سلیقہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس سے وہ ترقی کرتے یا بلندی کا کوئی ایک زینہ بھی طے کر لیتے اس صحرا کو چھوڑنا پڑا جہاں نہ اس کے قدموں کے نشان تھے نہ کوئی آہٹ زندگی انھیں مراحل سے گزر رہی تھی۔

پیچیدہ حالات سے دو چار تھی ایسا لگا کہ کوئی صدا دے رہا ہے ایسی صدا جو حق و سچائی کی تابع وار تھی دل

خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگا اور ایسا محسوس ہوا کہ شاید اسی آواز کے سہارے انسان اپنی منزل کو جلد از جلد پا لے گا۔

چوتھا بند:۔

مکہ کے پہاڑوں سے ایک ایسی گھٹا اٹھتی ہے جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں مرعوب ہو جاتی ہیں۔ چاروں طرف لوگ اسکے بارے میں چرچے کرنے لگے ہر زبان پر ان کا ذکر تھا۔ اس کی چمک اور اس کی تیزی اس کی روانی ایسی تھی کہ نہ جانے اس کی آواز کہاں کہاں تک پہونچی ہندوستان تک اس کی صدا سنائی پڑی۔ ایسا پانی برسا جس سے انسان کیا تمام چرند پرند گویا سب کو اپنی غذا مل گئی ہر طرف سرسبزی نظر آنے لگی۔

پانچواں بند:۔

عیسائی مذہب کے ماننے والوں نے ایرانیوں نے صفا مروہ پہاڑی کے باشندوں نے اسلام کو قبول کیا ان کی اخلاقی قدروں کو سراہا اپنے اخلاقی معیار کو برھایا اسلام کے پرچم تلے ہر خاص و عام جمع ہوئے اس کی روشنی نے جہالت کی تمام دیواروں کو توڑ دیا ایسا کوئی بھی گھر نہیں بچا جہاں علم کی روشنی اور اُجالے کی چمک نہ پہونچی ہو۔

چھٹا بند:۔

ارسطو اور افلاطون کا بیش قیمتی فن جسے لوگوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ جس چیزوں کو لوگ ایک طرح سے بھول گئے تھے جو علم بے جان پڑا ہوا تھا اس کو نئی زندگی ملی لوگوں تک پہونچانے کا بیڑا اٹھایا۔ ہر چھوٹے بڑے سبھی لوگوں میں علم کی حکمت کی روشنی پھیلا کر ہر شہر کو علم و ادب کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے لوگوں کی آنکھوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا اسے ہٹا دیا گہری نیند سے انھیں جگا کر زندگی میں کچھ کر گزرنے کی تلقین کی۔

ساتواں بند:۔

میکدے جو جام و ساغر سے خالی ہو چلے تھے یعنی جہاں علم نہیں پہونچا تھا وہاں بھی علم کا نور جاری و ساری ہو گیا جس میں ہر شخص سیراب ہو گیا علم کی روشنی کی طرف ایسے بڑھے جیسے پروانہ شمع کی طرف ایک ہی چیز ان کے پیش نظر تھی انہوں نے ایک گانٹھ باندھ لی اور حضرت علیؓ کے قول پر عمل کیا ''علم حکمت مومن کا کھویا ہوا مال

ہے جہاں ملے اٹھا لو"

آٹھواں بند:۔

چاہے کوئی بھی علم ہو فن ہو سب کے ماہرین موجود تھے چاہے زراعت و کاشتکاری کا میدان ہو یا دنیا کی سیاحی کی تمام ملکوں میں ان کا ہنر اجاگر ہوا مکان بنانے کا ہنر تجارت کرنے کا سلیقہ سبھی خوبیاں اپنے پورے اوصاف کے ساتھ موجود تھیں۔

نواں بند:۔

جو پہاڑ و جنگل بے حد خطرناک تھے جن کے راستے بے حد پیچیدہ تھے مشکل تھے جہاں کبھی کسی نے ایک پھول بھی نہ دیکھا تھا۔ اس جگہ کو بھی انھوں نے اپنی محنت ولگن سے ایسا دلکش باغ اور خوبصورت چمن بنایا جس پر ساری دنیا رشک کرنے لگی۔ آج ہر طرف بہار ہی بہار نظر آتی ہے اس کے پیچھے نہ جانے کتنے لوگوں کی بے شمار کاوشیں ہیں جو پودا انھوں نے لگایا تھا آج وہ ایسا تناور درخت بن گیا ہے۔ جس کے سایہ میں آج ہم خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔

دسواں بند:۔

وہ علم و حکمت کے بیش قیمتی نگینے موتی وہ پوشیدہ راز وہ اہم سبق جو لقمان ارسطو اور افلاطون کے ذریعہ ملے تھے لیکن حالات کی گردشوں نے اسے دفن کر دیا تھا خاموش کر دیا تھا یہی وہ زمین ہے جہاں پھر سے انہیں نئی زندگی ملی اور خوشبو دور دور تک پھیلی۔

گیارھوا بند:۔

علم پروری اور ادب نوزی کا یہ عالم تھا اس قدر ذوق و شوق پیدا ہوگیا تھا کہ جیسے علم ان کی اہم ضرورت بالکل اسی طرح جیسے زخمی انسان مرہم کو دیکھتا ہے یا زخم کے لیے مرہم ان کی پیاس میں اتنی شدت تھی اتنی گرمی تھی کہ جسے کوئی بھی بارش یا اوس نہیں بجھا سکتی تھی۔ شاید اسی لیے مصرویوناں کا تمام علم اس دور کے ہر انسان کو آشنا کر چکا تھا۔

"تعلیم سے بے توجھی کا نتیجہ"

1- شاعر کہتا ہے جن لوگوں نے علم کی اہمیت اس کی حیثیت اصل قدر و قیمت نہ جانی ان کی زندگی ہمیشہ کے لیے تاریکی میں گم ہوگئی خواہ وہ کسی ملک کے بادشاہ ہوں حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ ہو سب بیکار ہے علم کی کمی سے سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ امیری کی جگہ غریبی چھا جاتی ہے۔خاندانی عزت وعظمت خاک میں مل جاتی ہے اپنے کو شریف کہنے والے انسان جھوٹے کہلانے لگتے ہیں علم کی کمی انسان کو ادھورا رکھتی ہے کبھی کبھی وہ بے بس ہوجاتا ہے۔

2- کسی پیشہ میں برکت نہیں ہوتی کام کرنے والے کاریگر شاید علم کی کمی سے وہ ہنر وہ لیاقت اپنے اندر نہیں پیدا کر پاتے شاید اسی لیے کامیابی نہیں ملتی تجارت بند ہو گئے بڑے بڑے آسامی سوداگر جنکے پاس دولت ہی دولت بھی ان کو بھی پریشانی نے آگھیرا پیسے پیسے کے محتاج بالکل خالی ہاتھ۔

3- صبح شام کی پیش رفت میں نہ جانے یہ ہنر جاننے والے لوگ کہاں چلے گئے کہاں کھو گئے۔ ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے ادیبوں کی عزت کم ہوگئی ان کا معیار گرتا جا رہا ہے طبیب میں وہ خوبی نہ رہی جو اس کی شناخت تھی کہ نبض دیکھ کر مرض پہچان لے شاید اس لیے ان کے دوا خانے بند ہوگئے تمام فلسفی بڑے بڑے ناظم ان کی بھی اہمیت نہیں رہی۔

4- تعلیم کی کمی ان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے انھیں کسی چیز کی پہچان نہیں اگر انھیں ایک ٹوپی بھی بنانی ہے تو یہ تمیز نہیں کہ کپڑا کہاں سے لیں کس کپڑے کی بنانا بہتر ہوگی سوئی کیسی استعمال ہوگی کہاں سے لینی بہتر ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے گویا محتاج ہیں یہی وجہ ہے کہ ترقی کرنے کے بجائے تنزلی کا شکار ہیں۔

5- آج حالت یہ ہے کہ ان کی پاس سونے کے لیے بستر نہیں اوڑھنے کے لیے چادر نہیں ان کے گھر برتنوں سے خالی ہیں گھر کو اراستہ کرنے والے تمام زیور ختم ہیں گھر کی ضروریات کا کوئی سامان

مثلاً چاقو قینچی تیرونشتر وصراحی نہ وہ جام ہے مجلس و دفتر بھی اپنے سازوسامان سے خالی ہیں ایک خالی پن ان کی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔

6- مغرب سے جو سامان آتا ہے جو اس ملک میں روزی روٹی کا ذریعہ ہے اگر یہاں اسے کوئی نہ خریدے تو پیسوں پیسوں کے محتاج ہو جائیں گے۔ ان کا ہنر ان کا فن سب بیکار ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ تجارت بھی بند ہو جائے تو ضروریات زندگی کے سازوسامان کے لیے بھی محتاج ہوجائیں گے۔ ان کی تمام تر کامیابی ترقی دوسروں کے سہارے پر ہوتی ہے ان کی اپنی نہ کوئی پہچان ہے نہ شناخت وہاں کے بڑے بڑے لوگ پیسے والے تاجر بھی کو یہاں کا مرہون منت ہونا چاہیے کسی کے طفیل میں کبھی کبھی سارے کام ہو جاتے ہیں۔

7- اپنی پوری توجہ اگر تعلیم پر دی جاتی تو آج اتنی سزائیں اتنی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑتا کاش اب بھی وقت ہے اب سے آنکھ کھل جائے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے کیونکہ خدانخواستہ اور مزید پریشانیوں نے گھیر لیا مصیبتوں کا قہر ٹوٹ پڑا تو کیا ہوگا ہوائیں اتنی تیز ہیں کہ سب کچھ اڑا لے جانے کو تیار ہیں ہاتھ میں آتے آتے چیز رہ جاتی ہے جو چراغ جل رہے ہیں کوشش یہ کرنی پڑے گی ان کی روشنی قائم رہے ہمیں فانوس کا انتظام کرنا ہی پڑے گا خود کو اس اہم کام میں لگانا ہی پڑے گا۔

8- ایک ایک چیز کا حساب لینے کے لیے زمانہ کھڑا ہے ہر طرح کی فوج کا جائزہ لے رہا ہے جنھیں جس قابل سمجھا جس ہنر میں ماہر سمجھا انھیں ان کی جاگیر عطا کر دی کیونکہ یہ تو تمام ہنر سے خالی ہو چکے ہیں کوئی بھی فن ایسا نہیں جسمیں یہ ماہر ہوں انھیں کمال حاصل ہو اسلیے ان کا نام ہر جگہ سے ختم ہوتا جا رہا ہے نہ جانے کب اس کا خیال آئے گا۔ اور اپنی بے بسی اور کم مائگی کا احساس ختم ہوگا۔

☆☆☆

علاّمہ اقبال

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جامع زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں ہے زندگی
(اقبال)

مسلسل حرکت وعمل کا پیغام دینے والے برصغیر کے عظیم شاعر علامہ اقبال ۹رنومبر ۱۸۷۷ء میں صوبہ پنجاب کے سیالکوٹ شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی جیسا کہ اس زمانے میں رواج تھا۔ سید میر حسن شاہ سے بھی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے مڈل پاس کیا۔ ۱۸۹۵ء میں اسی جگہ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کا عہدہ مل گیا۔ ۱۹۰۳ء تک اس عہدے پر کام کیا۔ مگر علم کی پیاس شدت سے محسوس کرتے رہے چنانچہ مزید تعلیم کے لیے ۱۹۰۵ء میں یورپ کا سفر کیا اپنی نظم نالہ فراق میں ایک جگہ کہتے ہیں:

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

اقبال کی شاعری میں قیام یورپ کا زمانہ بے حد اہم ہے اگرچہ یہ تین سالہ قیام تھا مگر اقبال کی فکر کو جو روشنی یہاں ملی وہ بہت اہم ہے۔ ۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی، جرمنی سے فلسفہ کے موضوع پر پی۔ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد لندن سے بیرسٹر کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس آگئے۔

انگلینڈ کی واپسی پر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ یکم جون ۱۹۲۲ء میں برٹش گورنمنٹ نے ''سر'' کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء تک کونسل کے ممبر بھی رہے۔ چونکہ علامہ اقبال سیاسی رجحان رکھتے تھے چنانچہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی اس سلسلے میں اٹلی، مصر، فلسطین کا بھی سفر کیا۔ تیسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۲ء میں بھی شرکت کی۔ اسپین بھی گئے۔ ۱۹۳۳ء اکتوبر میں شہنشاہ افغانستان کی دعوت پر افغانستان بھی گئے۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری بھی ملی۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

اقبال کے اردو کلام کے چار مجموعے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز، ہیں۔ فارسی میں اسرار خودی، رموز بے خودی، اور پیام مشرق، جاوید نامہ، پیام مشرق کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ پیام مشرق کی بنا پر انھیں شاعر مشرق بھی کہا جاتا ہے۔

کوئی بھی بڑا فنکار اپنی تمام تر انفرادیت کے باوجود اپنی نجی زندگی کے کوائف اور اپنے عہد کے اجتماعی اور معاشرتی میلانات کچھ اجاگر اور کچھ پوشیدہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ کے نشیب وفراز سے متاثر ہوتا ہے۔ زمانے کی تبدیلیوں کو قبول کرتا ہے یہ ردعمل کبھی تو اخذ وقبول کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی اصلاحی اور انقلابی عمل کی شکل میں ہوتا ہے۔

اقبال اپنے دور کے محرکات ورجحانات سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے اس دور پر ایک دانشور، مفکر اور شاعر کی حیثیت سے نگاہ ڈالی۔ ان کی یہ نگاہ بالکل غیر جانبدارانہ تھی جو کوئی شے انھیں اپنی فکر سے قریب لگی انھوں نے اسے اپنی فکر میں جگہ دی اور جہاں کوئی خامی یا کمی محسوس ہوئی انھوں نے اس پر ایک ردعمل کا اظہار کیا۔ اس ردعمل کو ہم فرقہ پرستی کے ضمن میں نہیں رکھ سکتے ان کی شاعری میں انسانی تہذیب کو زبردست مقام

حاصل ہے۔

اقبال نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں ساری دنیا میں مختلف تبدیلیاں ہورہی تھیں۔ ہندوستان بھی اس کے اثرات قبول کرچکا تھا۔ سرسید کے مبارک ہاتھوں سے مسلم قوم کی بیداری کا کام شروع ہوچکا تھا۔ وطن کوآزادی دلانے کی کوشش جاری تھی۔۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ایک ایسی فضا پیدا کردی تھی جو ناقابل برداشت تھی ہماری تہذیب وتمدن پر بھی اس کے اثرات ثبت ہوچکے تھے ایک خلفشار پھیلا ہوا تھا۔ اپنی تہذیب سے بھی لوگ بیگانہ ہورہے تھے۔ جو کچھ بچ رہا تھا اس پر صوفیت اور مولویت کا ہی غلبہ تھا۔ بقول عابد علی عابدؔ:

> ''واقعہ یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آغاز سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک مسلمانوں پر جو کچھ بیت گیا اس کے کئی پہلو کی ترجمانی نہیں کی گئی اس سے اقبال کو یہ گمان ہوتا تھا کہ ۱۹ ویں صدی کے شعراء اور انشاء پرداز تغزل اور تصوف کو زندگی سے فرار حاصل کرنے کے وسائل کے طور پر استعمال کرتے تھے''۔

اقبال کی شاعری اس عہد کی تخلیق ہے جب ہندوستان میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کشمکش کا شکار تھی۔ مسلمانوں کے خیالات ابہام کا شکار تھے بے یقینی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی اس لئے اقبال کی شاعری مسلمانوں کے لئے خاص طور پر تقویت اور سکون کا پیغام محسوس ہوئی فلسفیانہ گہرائی اور خیالات کی بلند پروازی ان کے کلام کی بنیادی صفت ہے۔ انھوں نے اپنی فکر مشرق اور مغرب دونوں سے مستعار ہیں جہاں ایک طرف مغرب کے عظیم فلسفی اور مفکر ہیگل نطشے برگ سانس مارکس اور لینن نے اقبال کے ذہن کو متاثر کیا تو دوسری طرف رومی سنائی، غزالی اور جمال الدین وغیرہ نے اقبال کے کلام کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لیا۔

اقبال کی شاعری میں سرسید ، حالی، شبلی اور اکبر کی روایات کا امتزاج بھی۔ علم وفن کی زیادہ بلند سطح پر جو رجحانات ان کے یہاں دبے ہوئے تھے وہ اقبال کے یہاں شدت سے ابھرے ہیں۔ جو خاکے نامکمل تھے انھیں اقبال نے رنگ آمیزی کی۔ عابد علی عابد نے لکھا:

اقبال نے سرسید اور حالی کے کاموں کی تکمیل کردی بالفاظ دیگر اقبال کا شعری محرک سرسید تحریک اور حالی کا اسلوب فکر تھا"۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:"اقبال نے اسلام کی عظمت کا تصور تو حالی سے اور مغربی تہذیب کے نفی کا تصور اکبر سے مستعار لیا اور یوں قطعاً غیر شعوری طور پر ایک بلند سطح پر آ کھڑا ہوا"۔اقبال نے مغرب سے جو تصورات لئے انھیں اپنے مخصوص تصورات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اصلاح پسندی اور ماضی پرستی یہ دونوں رجحانات ان کے یہاں واضح طور پر ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں ماضی کی جھلک دکھائی دیتی ہے کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ ماضی کی یادوں کو تازہ کررہے ہیں۔ شاید اسی لیے انھیں ماضی پرست بھی کہا گیا مگر یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ مستقبل کی بنیاد وہی ماضی ہوتا ہے۔ اقبال کی پوری شاعری فلسفہ زندگی سے عبارت ہے مسلسل عمل اور حرکت میں ان کی نظر میں زندگی کا دوسرا نام ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جامع زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازدوام زندگی

اقبال کی فکر میں ان کے گھریلو پس منظر ان کے والدین ان کے اساتذہ کا بہت زیادہ نمایاں رول رہا ہے جنھوں نے اقبال کے فکر پر اپنے ابتدائی دور میں گہری چھاپ چھوڑی جو بعد تک ان کی شاعری میں ابھرتی رہی اور پھیلتی چلی گئی۔ اقبال کی شخصیت پر ان کے استاد میر حسن کی شخصیت بھی اثر انداز ہوئی۔ اقبال نے جب اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا تو میر حسن کی عالمانہ غور وفکر اور رہنمائی نے اقبال کو اقبال مندی کی آخری منزل تک پہنچانے میں نمایاں ساتھ دیا۔ میر حسن نے ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور ان کے ابھرتے ہوئے رجحانات کو دیکھتے ہوئے خودنگہبانی کا ذمہ لے لیا۔ میر حسن کی دور رس نگاہوں نے اقبال کے اندر آنے والے دور کی خاص جھلک دیکھ لی تھی۔ اقبال کی تعلیمی زندگی کو متعین کرنے میں میر حسن نے جو بھی کام انجام دیا اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کی فارسی عربی اور مذہب سے دلچسپی نیز اسلام کے بارے میں خیالات کو انھیں کی تعلیمات کا پرتو کہا جاسکتا ہے۔

اقبال کو اس بات کا فخر تھا کہ انھوں نے میر حسن کی شخصیت سے فائدہ اٹھایا۔"خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر" دراصل یہ انداز اقبال کے لئے انھیں کی دین تھی۔ ذکر اقبال کے مصنف نے لکھا ہے۔

اقبال کی سادگی اور ان کی قناعت اور ان کا استغنا مسلم ہے وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے یہ استغنا شاہ صاحب سے سیکھا ہے۔

اقبال نے ان اشعار کے ذریعہ اپنے استاد کو ایک خاص انداز سے نذرانۂ عقیدت پیش کی ہے:

وہ شمع بار گہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کی کھلی میرے آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

کامیابی کی اعلیٰ منزل تک پہنچانے میں جہاں مولوی میر حسن شاہ کے درس نے بڑا کام کیا وہاں ان کے دوسرے استاد جناب آرنلڈ کی تعلیم نے نمایاں حصہ لیا جن سے علامہ اقبال نیک فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اقبال کے نزدیک ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ جس کا اعتراف مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے کرتے تھے چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب آرنلڈ ولایت چلے گئے تو علامہ اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں اپنی نظم نالہ فراق میں کہا۔

ہوگئی رخصت مسرت غم میرا ہمدم ہوا

اقبال نے اپنی ذکاوت اور ذہانت سے ایک استاد کو اپنی طرف متوجہ کیا اور دوسرے استاد کو دوست بنالیا پروفیسر آرنلڈ کی بصیرت افروز شخصیت کے زیر سایہ علم وادب کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ شاعری میں اقبال نے اپنے ابتدائی کلام میں داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ جس کا عکس اقبال کے ابتدائی کلام میں نظر آتا ہے۔ بقول عبدالقادر:

"اقبال نے داغ کی زندگی میں ہی قبول عام کا وہ درجہ حاصل کرلیا تھا کہ داغ مرحوم کو اس بات کا فخر تھا کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی"۔

اقبال کی شاعری کا آغاز ان کی طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں "نالہ یتیم" نظم پڑھی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

چھیڑو سرور ایسا کہ جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تاب جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری

۱۹۰۱ء میں رسالہ مخزن میں اقبال کی نظم ہمالہ شائع ہوئی اس نظم نے اقبال کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کی شاعری کا پہلا دور خاص طور سے وطنی شاعری پر مشتمل ہے جیسے ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا گیت، نیا شوالہ، تصویر درد، ترانہ ہندی وغیرہ۔ اقبال نظم ہمالہ میں ہندوستان کی عظمت اور محبت کا اعتراف اس طرح سے کرتے ہیں۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں فرماتے ہیں۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

عالمی شہرت یافتہ ترانہ ہندی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نظم نیا شوالہ کا خاص کر یہ مصرعہ

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اقبال کی ابتدائی نظموں کے بارے میں قمر رئیس صاحب لکھتے ہیں:

''وطن اور اہل وطن کی جس والہانہ محبت نے ان کی ابتدائی دور کی وطنی نظمیں کہلائیں، بنی نوع انسان سے ان کی شیفتگی محبت اور احساس اخوت نے وہ کہلائیں جو قوم پرستی کا رد تھیں لیکن جذبہ وطن دوستی کی زد نہیں تھی''۔

اقبال نے ہندوستان کے ہندو پیشواؤں پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ رام کے بارے میں کہتے ہیں۔

ہے رام کے وجود سے ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

گرونانک کی خدمت میں اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اقبال یورپ گئے۔ مغربی تہذیب اور وہاں کے نظام حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں کے مشہور عالموں سے ان کی ملاقات ہوئی اقبال نے محسوس کیا کہ یہاں کے لوگ وطن پرستی کے لباس میں خود غرض ہیں۔ رنگ ونسل اور قوم می تفریق کرتے ہیں وطن پرستی کو بنیاد بنا کر طاقت کے زور پر کمزور ملک کو ختم کرنا چاہتے ہیں نظم وطنیت میں وطن پرستی پر ضرب کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں۔

اس دور میں مہ اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنائی روش لطف کرم اور
مسلم نے تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال وطن کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اور آزادی پر جان دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ غلامی انسان کی تمام خوبیوں کو مٹا دیتی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب مرد مومن کی سب سے اعلیٰ صفت آزادی کو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کو وہ قومیں وہ قبائل وہ افراد یہاں تک کہ وہ جاندار بھی عزیز ہیں جو آزادی کو عزیز رکھتے ہیں اور کسی قیمت پر اس کا سودا نہیں کرتے''۔

اقبال کے نزدیک فکر وخیال کی آزادی بے حد ضروری ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی حیثیت ایک جوئے کم آب ہو کر رہ جاتی ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

غلامی کی زندگی گزارنا سب سے بڑی ذلت کی بات ہے بلند ارادی اور آزادی کا راستہ انھیں پسند تھا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جب انسان دوسروں کے ماتحت رہتا ہے اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے انسان کو باہمت اور حوصلہ مند ہونا چاہئے کم ہمتی سے پیدا ہونے والے قناعت کی مذمت کرتے ہیں۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اقبال نے مساوات پر بہت زور دیا ہے۔ وہ ان تمام کوششوں کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں جو انسان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرنے کے لئے کی گئی ہو اقبال کی نظر میں سبھی لوگ اسلام کے ماننے والے ہیں ایک ہی خدا کی

بندگی کرتے ہیں پھر یہ ذات برادری کی تفریق کیسی کہتے ہیں۔

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو

انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے تا کہ اس کی جماعت کا نظام مضبوط ہو سکے۔ قومیت نسل ورنگ اور اسی قسم کے دوسرے اختلافات غلط ہیں اگر اختلافات موجود ہیں تو وہ کبھی زندگی کو منور نہیں کر سکتا۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

اقبال تمام انسانوں کے مسائل پر خلوص وہمدردی سے نظر ڈالتے ہیں اور ان کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں وہ لینن کے مداح ہیں۔ ''لینن خدا کے حضور میں'' ان کی ایسی نظم ہے جس میں انسانیت کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ اقبال لینن کی زبان سے اپنے احساسات کو ظاہر کرتے ہیں وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ جو برائیاں ہیں ان کا خاتمہ ہو سکے۔ اقبال اشتراکیت کے اس لئے مداح ہیں کہ اسلام سے کچھ اعتبار سے قریب ہے۔ مساوات جو اسلامی تعلیم کی روح ہے اشتراکیت میں بھی اس کا درس دیا جاتا ہے۔

اقبال چونکہ زندگی میں حرکت عمل اور ارتقاء چاہتے تھے اس لئے وہ ابلیس کی جرأت ہمت اور اس کے استقلال کی تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے عالمی رہنماؤں کی تعریف کی ہے جن کے ساتھ ظلم اور خونریزی کا تصور وابستہ ہے لیکن اقبال نے ان کی ہمت اور استقلال کو سراہا ہے ظلم اور جبر کو نہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں شاہین کو ایک پیکر عمل کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل ہے اس کی خونریزی کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے خون گرم رکھنے کا بہانہ ہے وہ کمزور لوگوں میں بھی ہمت اور بہادری پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنے سے بڑی طاقتوں سے بھی ٹکرا جانے کی دعوت دیتے ہیں۔

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اس روزوشب میں الجھ کے نہ رہ جا

کہ تیرے زمان ومکاں اور بھی ہیں

اقبال نے اپنی شاعری میں جہاں جہاں بھی شاہین کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی بلند پروازی نظر کی تیزی اور اس کے آشیاں نہ بنانے کی تعریف کی ہے اس میں خودی ہے انھوں نے شاہین کے پیکر میں ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی ساری خصوصیات بھردی ہیں ان کا شاہین بہادر بھی ہے اور خود مختار بھی ہے مگر اس کی یہ خونخواری عمل وحرکت کو ظاہر کرتی ہے اور خون گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں ہے

کہ ہے باز کی زندگی زاہدانہ

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر

توشاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اقبال کے یہاں خودی زندگی کا مرکز ہے خودی سے مراد یہ کہ انسان اپنے آپ کو پہچانے انسان کے لئے سب سے مشکل کام ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا۔ جگر مرادآبادی نے ایک شعر میں کہا۔

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی

مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

انسان نے آج کتنی ترقی کرلی یہ سچائی یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن تعجب کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ آج انسان نے زندگی پر اتنے پردے ڈال رکھے ہیں کہ اپنی ذات سے بیگانہ ہوگیا ہے۔

جبکہ یہ کائنات اور اس کے ارد گرد دوسری کائنات اس کی آنکھوں سے بے حجاب ہے مگر اپنے آپ کو پہچاننا نہیں چاہتا۔ کاش کہ وہ اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ کیا چیز ہے کیا وہ واقعی افضل ترین مخلوق ہے یا چلتی پھرتی کوئی مشین یعنی انسان اگر اپنے نصب العین پر نظر رکھے تو یقین کامل رکھے تو اس کی خواہش خدا کی رضا بن جاتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

زمین سے دولت حاصل کرنا اور ستاروں سے روشنی لینا اس کا حق ہے۔ اقبال نے اس خودی کی روح کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں پھونک دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ جذبہ زندگی میں رواں ہے اسی سے زندگی میں تڑپ ہے خودی کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو اطاعت اپنی خواہشوں پر قابو اور خدا کی نیابت سے الگ نہیں رہنا چاہئے۔ اقبال خدا کی وحدانیت کے ذریعہ ہی انسانی وحدت کے عقیدے تک پہنچے ان کا خیال تھا کہ ایک خدا پر ایمان انسان کو بہت سے چھوٹے خداؤں کے سامنے سر جھکانے سے بچاتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان مایوسی خوف اور غم کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے اسے اپنے اوپر یقین اور اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل پاکباز

اقبال کی نظر میں ضمیر اور روح کا انقلاب ہماری زندگی میں انقلاب لاتا ہے خوب سے خوب تر کی جستجو میں نئی نئی تمنائیں پیدا کرنے کے قائل تھے وہ مخلوق ہوتے ہوئے بھی خالق کے ساتھ تخلیقی عمل میں شریک ہونا چاہتے تھے اور زندگی کو عمل کا مظہر دیکھنا چاہتے تھے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت اور جہنم بھی
یہ انساں اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال نے ہمیں انسان کا جو شاندار تصور دیا ہے وہ ان کی شاعری سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انھوں نے انسانی عظمت پر زور دیا ہے وہ اسی دنیا میں انسان کی بہترین صفت کا عملی اظہار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کی سب

سے بڑی خوبی اس کی تخلیقی قوت ہے جس میں وہ فطرت کا جز ہوتے ہوئے بھی فطرت سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ ظلمت شب کو دور کرتا ہے پتھر سے آئینہ بنایا ہے سورج اور ستاروں کی روشنی اور قوت اس کے غلام ہیں ہوائیں اس کی فرمانبردار ہیں سمندروں پر حکومت کرتا ہے ہر انسان چھوٹے پیمانے پر ایک خالق ہے اور جو نظام اس کے تخلیقی قوتوں کو نقصان پہنچاتا ہے وہ فنا کر دیتا ہے انسانی تہذیب کی اصل روح احترام انسانیت ہے۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

انسان جب عروج پر پہنچ جاتا ہے وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے اس کی بلندی اور اڑان سے ستارے بھی سہمے نظر آتے ہیں۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقبال نے انسان کو اپنی شاعری کا محور بنایا اور اس کے اردگرد اپنی شاعری کے تانے بانے بنے۔ کلام اقبال میں انسان کی وہ جھلک ملتی ہے جو تاریخ ساز ہے۔ تہذیب کے شگوفے کھلاتا ہے اور زندگی کو ہمیشہ متحرک رکھتا ہے

اس لئے ان کی شاعری میں آفاقیت ہے۔ اقبال کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر تاریخی واقعات پر ان کی نظر رہی سماج میں رونما ہونے والی ہر تحریک کو اپنے فکری گوشے میں جگہ دی۔ آل احمد سرور نے اقبال کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال کی عظمت کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں ہمارے تمام شعراء سے زیادہ واضح طور پر ۲۰ویں صدی کی زندگی کے تمام موڑ اور نشان ملتے ہیں دراصل اس دور کا کوئی اہم واقعہ اور حادثہ ایسا نہیں جس کے متعلق اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو''۔

اقبال نے اپنی شاعری سے جو کام لیا اس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی اقبال کے افکار وتاثرات میں ایک وحدت ہے۔ وہ وحدت انسان کی ذات ہے اسی انسان سے اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اسی پر اپنی فکر کا خاتمہ۔

ڈاکٹر خدیجہ طاہرہ

شعاعِ امید

نظم جدید کی تاریخ میں اقبال کی شاعری کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی نظمیں ایک تاریخی موڑ رکھتی ہیں۔ اقبال نے زیادہ تر نظمیں لکھیں جیسے قومی وطنی، ملی تاریخی دعائیہ نظمیں غرض کہ نظموں کے مختلف انداز انھیں جابجا دکھائی پڑتے ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں فکری عنصر بہت زیادہ حاوی ہے جس کو ہم فلسفہ طرازی کا نام دے سکتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں فلسفیانہ جذبات میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ جیسے شمع، موج دریا، سرگزشت آدم، جگنو، بچہ اور شمع محبت، نوائے غم، فلسفہ غم، انسان کا مکالمہ، ارتقا بزم انجم شعاع امید وغیرہ۔

اقبال کی نظم نگاری کے بارے میں وزیر آغا نے لکھا ہے:

> ''اقبال نے نظم کو خارجی زندگی کے بیان کے علاوہ داخلی زندگی کی عکاسی کے لئے استعمال کیا اور یوں گویا فرد کی داخلی دنیا کو برانگیختہ کیا۔ انفرادیت کی طرف اقبال یہی رجحان اسے جدید اردو نظم کا اوّلین علمبردار قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ آگے چل کر جدید اردو نظم میں انفرادیت کا بھر پور رجحان وجود میں آیا۔ اقبال کے اس اقدام کے بغیر ممکن نہیں تھا''۔

اقبال نے وطن کے مسائل کو جگہ جگہ اپنے خیال کا عنوان بنایا ہے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے فکر مند تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی بیداری پورے ایشیا کی بیداری ہے اس لئے وہ ہندوستان کو بیدار کر کے

قوم کی حالت میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے۔اس لئے انھوں نے مسلسل عمل وحرکت کا پیغام دیا۔انھیں ایسا لگتا تھا کہ ان کے سہارے زندگی کی ہر جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے دنیا کو اپنے قبضے میں کرسکتا ہے۔ نصاب میں داخل اقبال کی نظم شعاع امید بھی اسی جذبے کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔

اقبال کی شاعری میں ایک خاص بات ہے کہ وہ امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے خراب سے خراب حالات میں بھی ہمت اور حوصلہ سے کام لیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی اقبال نے خوبصورت شعری فضا اور خوبصورت منظر تخلیق کرکے نظم کو بہت ہی مؤثر اور دلآویزی بخشی ہے۔اس نظم کا خاص کردار سورج اور اس کی کرنیں ہیں اور اقبال کے خیالات کی نمائندگی کرتی ہوئی ایک شوخ چنچل اور سیماب جیسی صفت رکھنے والی کرن ہے۔

نظم کی شروعات اس طرح سے ہوتی ہے۔ سورج اپنی شعاعوں سے ہمکلام ہے کہتا ہے کہ دنیا اپنی کشش کھوچکی ہے اس کے پھولوں کی دلآویزی اور ریت کے ذرّوں کی چمک ختم ہوگئی ہے مغربی مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش ہوچکا ہے۔ مشرق ان سب چیزوں سے پاک ہے لذت نظارہ سے محروم بھی نہیں مگر وہاں اتنی خاموشی ہے کہ عالم لاہوت کا گمان ہورہا ہے۔ جمودطاری ہے بے عملی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس لئے سورج کہتا ہے کہ تم مشرق ومغرب میں پھیل جاؤ روشنی بکھیردو مگر شعاعیں اس کوشش میں ناکام ہوجاتی ہیں اور پھر سورج کا حکم پاتے سورج سے ہم آغوش ہوجاتی ہیں۔

ایسے مایوس کن حالات میں سیماب صفت کرن دوسری کرنوں کی طرح لوٹنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ امید کا دامن نہیں چھوڑتی وہ سورج سے روشنی مانگتی ہے جس کی مدد سے وہ مشرق کا ذرّہ ذرّہ روشن کردوں گی۔ اور یہ عزم کرتی ہے کہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کردیتی ہندوستان کی تاریک فضا کو نہیں چھوڑوں گی۔ وہ ہندوستان کو اپنی امیدوں کا مرکز قرار دیتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی سرزمین کو اقبال نے اپنے آنسوؤں سے سیراب کیا ہے۔ ہندوستان کی خاک سے ہی چاند ستارے روشن ہیں۔ یہاں کے کنکر پتھر کسی موتی سے کم نہیں اس ملک میں بڑے شاعر فلسفی، عالم، مفکر اور دانشور پیدا ہوئے جنھوں نے بڑے بڑے مسائل اپنی دانشمندی اور حکمت سے حل کئے

اس سے متعلق نظریات دیئے۔

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کا وہ ساز خاموش ہے جس سے ایسے نغمے نکلتے تھے جو دلوں کو حرارت بخشتے تھے۔ حرکت وعمل کی تلقین کرتے تھے۔ کہنے کا مطلب کہ بڑی بے عملی ہے جوش وحرکت کا جذبہ ختم سا ہوگیا ہے۔ اسی بے عملی کا نتیجہ ہے کہ آج برہمن بت خانے کے دروازے پر سو رہا ہے۔ اور مسلمان مسجد میں بیٹھ کر اپنی قسمت سے نالاں ہے۔ آنسو بہا رہا ہے یعنی دونوں ہی قومیں بے عملی اور غفلت کا شکار ہیں۔ مگر وہ شوخ کرن کہتی ہے نہ مغرب سے نفرت کرو اور نہ مشرق سے پرہیز کرو بلکہ آگے بڑھو اور تاریکی کا پردہ چاک کر کے ساری دنیا میں روشنی پھیلا دو۔ نور کا سماں پیدا کردو۔ سورج کی وہ شوکرن جو کہ ہمت اور حوصلے کی زندہ مثال ہے اس کے ذریعہ اقبال یہاں کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ بے عملی کا مظاہرہ چھوڑ دیں اور میدان عمل میں پورے جوش وخروش کے ساتھ اتر پڑیں کیا ہندوستان جیسے عظیم ملک میں کوئی ایک شخص بھی یہاں کے لوگوں کو بیدار نہیں کرسکتا۔ قوم کی سربراہی اس کی قیادت نہیں کرسکتا۔ قوم کا بیدار ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ انسان دنیا کی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ افضل ہے۔ خدا نے یہ دنیا اسی کے لئے بنائی ہے اس کی حیثیت خدا کے نائب کی ہے پھر اس میں یہ جمود کیسا۔ اگر وہ کمر کس لے تو ساری کائنات میں ایک انقلاب لاسکتا ہے ہر تاریکی کو چاک کر کے ایک نئی صبح کی تعمیر کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر کلیم الدین نے اس نظر کو اقبال کی کامیاب ترین نظم قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کیسی حسین وپاکیزہ نظم ہے یہاں ارتقائے خیال سے اشعار میں ربط وتسلسل ہے خیالات میں ابتدائی عروج اور پھر انتہا بھی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں نظم ہے۔ غزل نے نظم کا بھیس نہیں بدلا ہے۔ خیالات میں تخیل کا رنگ ہے طرز ادا سادہ اور پاکیزہ ہے بار بار، پڑھنے سے اس کی دلکشی میں کمی نہیں اضافہ ہوتا ہے۔ کاش اقبال اس قسم کی اور نظمیں لکھتے''۔

☆☆☆

بزم انجم

یہ نظم فنی اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے اس میں تشبیہ اور اشعار ے سے ساتھ ساتھ کنائے کا بھی خوبصورت استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ شام کے لیے سیہ قبا کا انتخاب شفق کی سرخی کے لیے لالہ کے پھول کا انتخاب یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ اقبال کو لالہ کا پھول گلاب کے پھول سے زیادہ پسند تھا بلکہ ان کی پوری شاعری میں علامتی انداز بھی اختیار کر گیا اور یہ ان کا پسندیدہ رمز بھی بن گیا۔

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے تاروں کی زبانی جو فلسفہ بیان کیا ہے اس سے ہماری قومی زندگی کے کئی راز جھلک پڑتے ہیں کیونکہ آپس کے میل ملاپ کی وجہ سے ہم ترقی کر سکتے ہیں تاروں کا جو نظام باہمی ہے وہ بس ہم کو یہ سبق دے رہا ہے کہ ہم بھی اسی طرح کا روان حیات کو اتحاد کی دوڑ سے باندھ رہے ہیں۔

پہلا بند:۔

پہلے بند میں شاعری کے تمام زیورات کا استعمال کر کے سجایا سنوارا گیا ہے۔ سورج جب غروب ہو رہا ہو تو آسمان سرخی مائل ہو جاتا ہے لگتا ہے دلہن بن گیا ہو جب دلہن ہو تو آرائش بھی ہوگی زیبائش بھی ہوگی۔

کیونکہ رات کی آمد ہے۔ لہذا چاند تاروں نے گہنوں کا کام کیا ہے بات صرف رات کی ہو رہی ہے لیکن شاعر نے کچھ اس طرح اس کو کہا کہ سورج دوبتے وقت سرخ ہو جاتا ہے اور ان کی سرخی سے آسمان بہت بھلا لگتے

ہے دن چونکہ رخصت ہونے کو ہے اس لیے سورج نے اپنے چاندی کے گہنے اتار لیے۔ شام نے سرخ جوڑا پہن رکھا ہے سجانے کے لیے چاند تارے بھی آگئے ہیں دلہن کے لیے ایک ڈولی کا انتخاب بھی کر لیا گیا ہے۔ جو رات ہے وہ گویا ڈولی ہے جس میں خاموشی سے کسی حسین دلہن کی آمد ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ دن اپنی تمام خوبصورتی کا خزانہ لٹا گیا تو رات نے بھی فیاضی سے کام لیا۔ رات بھی بے حد خوبصورت ہے آسمان پر تارے ہی تارے ہیں شاعر اپنی رنگینی بکھیر چکا ہے۔ پھر وہ اپنے پیغام پر آنا چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ رات کے دلفریب نظارے میں ایک آواز آئی ایک فرشتے نے تاروں سے کہا۔

دوسرا بند:۔

اے اسمان کے معزز تارو اے فلک کے نگہبانوں اس وقت تم کوئی ایسا نغمہ چھیڑو کہ زمین کے باشندے تمہاری آواز سے جاگ اٹھیں کیونکہ علم نجوم کی رو سے یہ زمینی باشندے تم کو اپنی قسمت کا آئینہ سمجھتے ہیں (تاروں سے اپنی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے) اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری آواز کو غور سے سنیں گے تمہارے نغموں کی تاثیر ان کو ضرور سوچنے پر مجبور کرے گی۔

تیسرا بند:۔

تاروں کی چمک دمک میں خدا کی جلوہ گری نمایاں ہے جب سے دنیا قائم ہے یہ جلوہ گری بھی تب سے قائم ہے تاروں میں خدا کا عکس یوں نظر آتا ہے جیسے شبنم کے قطرے میں گلاب کا عکس نظر آئے جو قومیں پرانے نظام یا روایتوں پر ٹکی ہوئی ہیں اڑی ہوئی ہیں یعنی لکیر کی فقیر بنی ہیں اور موجودہ حالات کے مطابق اپنے کو نہیں ڈھال پاتی ہیں وہ ترقی کے دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں ان کی بے حسی ان کو کبھی آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتی دوسری قومیں ان کو کچلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔

چوتھا بند:۔

اس بند میں شاعر کا پیغام اور بھی واضح ہو جاتا ہے ستارے اپنے نغمہ میں یہ بھی سنا رہے ہیں اس وقت جو ستارے ہماری آنکھو سے اوجھل ہو چکے ہیں ان کو بھی ہم اپنی برادری کا حصہ سمجھتے ہیں مراد یہ کہ ہم دنیا کے سبھی مسلمانوں کو اپنی برادری میں شامل سمجھیں چاہے وہ کسی بھی گوشہ میں رہے ہوں تمام مسلمانوں کا قومی نظام صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ ہندوستان ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے کے مسلمانوں کو ایک اتحاد کی ڈور میں باندھیں ہر مسلمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے مسلم کو اپنا بھائی سمجھیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس نظم کے ذریعہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کو ربط وضبط کا ایک مربوط فلسفہ دیا کیوں کہ اتحاد کو ہر دور میں مضبوطی کی ناقابل تردید ضرورت سمجھا گیا ہے اس کی بنیاد پر قوم کا مستقبل ٹکا ہوا ہے۔

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

☆☆☆

NOTES

Session 2012-13 (200 Copies)

©School of Open Learning

Published by Executive Director, School of Open Learning, 5 Cavalry Lane, Delhi-7
Printed at : M/s. Amety Offset Printers,12/38, Site IV, Sahibabad Industrial Area, Ghaziabad (U.P.)